طرف دیکھ رہا تھا۔۔۔۔باغ کے مالی نے اس کے قریب آ کر کہا ''بھئی! تم بھی چڑھ جاؤ اپنی گھوڑی پر۔۔۔۔!''

ارشد نے بظاہر باغبان کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تاہم اس کے لیے تماشائی کی حیثیت میں کھڑا رہنا صبر آزما تھا۔تھوڑی دیر بعد سلیم نے اس کے قریب آ کر کہا ''ارشد آؤ تم بھی! یہ گھوڑی سرکش نہیں ہے آج تم اسی کو بھگا کر دیکھو، آئندہ میں تمہیں اپنا گھوڑا دیا کروں گا۔''

ارشد نے جواب دیا ''میں تمہاری طرح ننگی پیٹھ پر سواری نہیں کرسکوں گا''

''اچھا تو میں تمہیں زین ڈال دیتا ہوں'' یہ کہتے ہوئے سلیم اپنے گھوڑے سے کود پڑا اور اس کی باگ ارشد کے ہاتھ میں دے کر گھوڑی پر زین ڈال دی۔

تھوڑی دیر میں یہ تینوں باغ سے کچھ فاصلے پر ایک کھلے میدان میں گھوڑے بھگا رہے تھے ارشد کچھ دیر گھوڑی کو سرپٹ دوڑانے سے گھبراتا رہا لیکن جلد ہی اس کی جھجک دور ہوگئی۔تاہم جب کوئی کھائی سامنے آتی تو اپنے ساتھیوں کی تقلید کرنے کی بجائے گھوڑی کو روک لیتا۔ایک مرتبہ اس کی گھوڑی اس کی کوشش کے باوجود ایک چھوٹی سی کھائی پر سے کود گئی۔اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔

''سلیم! بھئی یہ گھوڑی تو بہت اچھی ہے'' اس نے خوش ہو کر کہا

''دیکھا! تم یونہی گھبراتے تھے''

شام کے قریب اگرچہ دھوپ کی تیزی کم ہو چکی تھی لیکن حبس پہلے سے بھی زیادہ تھا اور اس کے ساتھ ہی مغرب کے افق پر آندھی کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔سلیم

نے گھوڑا روک کر کہا ''مجید! ادھر دیکھو، آج آندھی آئے گی۔ چلو اب گھر چلیں!''

مجید نے اس کے قریب پہنچ کر اپنی گھوڑی سے اترتے ہوئے کہا ''ذرا گھوڑوں کا پسینہ سوکھ جائے تو چلتے ہیں ورنہ چچا افضل خفا ہو گا۔''

ارشد نے کہا ''بھئی مجھے دیر ہو جائے گی، چلو!''

سلیم نے کہا ''تم آج ہمارے پاس رہنا!''

''نہیں بھئی! میں گھر میں بتا کر نہیں آیا۔ ابا جان خفا ہوں گے۔''

مجید نے کہا ''تم فکر نہ کرو سلیم تمہیں اپنے گھوڑے پر بٹھا کر چھوڑ آئے گا۔''

سلیم نے اس بات کی تائید کی ''ہاں ارشد یہ گھوڑی ہم گاؤں میں چھوڑ دیں گے اور پھر میں تمہیں اپنے ساتھ بٹھا کر شہر چھوڑ آؤں گا۔''

ارشد اس بات سے مطمئن ہو گیا تھوڑی دیر نہر کے کنارے گھوڑوں کو تازہ دم ہونے کا موقع دینے کے بعد سلیم اور ارشد یک زبان ہو کر مجید کو اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اب تمہاری گھوڑی کا پسینہ سوکھ چکا ہے، اس لیے دیر نہ کرو اور مجید ہر بار انہیں یہ کہہ کر ٹال رہا تھا کہ ابھی شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ اتنی جلدی کیوں کرتے ہو۔۔۔۔ چونکہ مغرب کی طرف گھنے درختوں کی اوٹ تھی، اس لیے وہ افق پر اکٹھے ہونے والے گرد و غبار کی رفتار کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے لیکن اچانک سورج چھپ گیا اور باغبان نے آواز دے کر کہا:

''بھئی آندھی آ گئی! تم اب جلدی گھر پہنچو!''

سلیم نے کہا ''چلو ارشد، ہم چلتے ہیں!''

سلیم اور ارشد جلدی سے سوار ہو گئے۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ مجید بھی سر پٹ گھوڑی دوڑاتا ہوا ان کے ساتھ آ ملا۔ کچی سڑک پر تقریباً ایک میل تینوں ایک ساتھ گھوڑے بھگاتے رہے۔ اس کے بعد جب وہ کھیتوں میں سے گزرنے والی پگڈنڈی پر اترے تو سلیم نے اپنا گھوڑا آگے کرتے ہوئے ''ارشد تم میرے پیچھے رہو اور مجید تم اس کے پیچھے رہو۔''

پگڈنڈی پر وہ معمولی رفتار سے چلتے رہے۔ راستے میں جب کوئی کھائی آتی، سلیم ارشد کو خبردار کر دیتا۔ آندھی کے باعث فضا پر تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ مغرب کی سمت کے تمام گاؤں، درخت اور کھیت گرد و غبار کے بادلوں میں روپوش ہو رہے تھے۔

''ارشد ذرا سنبھل کر بیٹھو!'' سلیم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور گھوڑے کی رفتار ذرا تیز کر دی۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ انہیں آندھی نے آ گھیرا۔ ابتدائی جھونکے زیادہ شدید نہ تھے۔ لیکن گرد و غبار کی تاریکی میں ان کے لیے راستہ دیکھنا مشکل ہو گیا۔ ارشد چلا رہا تھا ''بھائی مجھے کچھ نظر نہیں آتا!''

مجید پیچھے سے اسے تسلی دے رہا تھا ''تم اطمینان سے گھوڑی پر بیٹھے ہو، یہ تمہیں سیدھی گھر لے جائے گی۔''

اچانک ہوا اس قدر تیز ہو گئی کہ ارشد اڑتے ہوئے تنکوں سے بچنے کے لیے بار بار اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

تھوڑی دیر بعد بادل کی گرج سنائی دی اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ سلیم

نے ایک بڑ کے درخت کے نیچے گھوڑا روک لیا اور اس کے پیچھے آنے والی گھوڑیاں خود بخود رک گئیں۔

''رک کیوں گئے؟'' مجید نے کہا

سلیم نے کہا ''ذرا گرد بیٹھ جائے تو چلتے ہیں''

ارشد نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ملتجی آواز میں کہا ''ہاں بھئی ذرا ٹھہر جاؤ! میری آنکھیں مٹی سے بھر گئی ہیں۔ مجھے کچھ نظر نہیں آتا!''

بادل کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ گرد تھوڑی دیر میں بیٹھ گئی لیکن ہوا اور بارش کی تیزی ہر لحظہ زیادہ ہوتی گئی۔

مجید نے کہا ''بھئی اب رات ہو رہی ہے۔ یہاں بھیگنے سے کیا فائدہ چلو!''

ارشد کچھ کہنے کو تھا کہ اچانک پاس ہی آم کے ایک بلند درخت کا تنا ٹوٹ کر بڑ کے درخت کے اوپر گرا اور اس کی کئی ٹہنیاں اپنے ساتھ سمیٹتا ہوا زمین پر آ رہا۔ گھوڑے ایک خوفناک آہٹ سے بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگ نکلے۔ سلیم اور مجید فوراً اپنے اپنے جانوروں پر قابو پا لیا لیکن ارشد کی گھوڑی چند قدم دور نکل گئی۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی بدحواسی پر قابو پا کر باگ کھینچتا، ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ سے اس کا سر ٹکرا گیا۔

جب سلیم اور مجید اس کی مدد کو پہنچے، وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ دونوں بیک وقت گھوڑوں سے کود پڑے اور ارشد! ارشد!! کہتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ گئے۔ سلیم نے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ بجلی کی چمک میں اس نے دیکھا کہ ارشد کے

ماتھے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے۔اس کے خون کا ہر قطرہ منجمد ہو کر رہ گیا۔ایک ثانیہ کے بعد وہ چلایا ''ارشد! ارشد!!'' اور اس کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی۔اس نے انتہائی بے کسی کی حالت میں مجید کی طرف دیکھا۔مجید نے جلدی سے اپنی پگڑی اتاری اور کس کر اس کے سر پر لپیٹ دی۔

''مجید! سلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا'' اب۔۔۔۔۔!اس ایک لفظ میں کئی سوالات اور کئی التجاؤں کے ساتھ سلیم اپنے ان احساسات کی ترجمانی بھی کر چکا تھا کہ تم بڑے ہو،تم سب کچھ سمجھتے ہو،تم بہت کچھ کر سکتے ہو،بتاؤ اب کیا کیا جائے،بتاؤ اب ہم کیا کر سکتے ہیں؟

اور مجید نے اس کے جواب میں جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا ''تم میری گھوڑی کی باگ پکڑو،میں اسے اپنے ساتھ لاد کر گھر لے جاتا ہوں۔تم یہاں سے سیدھے شہر جا کر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤ۔چھوٹی گھوڑی کو جانے دو،وہ خود بخود گھر پہنچ جائے گی۔''

سلیم نے اچانک یہ محسوس کیا کہ اس میں غیر معمولی قوت آ چکی ہے وہ جلدی سے مجید کی گھوڑی کو باگ سے پکڑ کر لے آیا مجید نے ارشد کو اٹھا کر گھوڑی پر ڈال دیا اور پھر سلیم کا سہارا لے کر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ایسے طوفان میں ایک بے ہوش ساتھی کو آگے بٹھا کر لے جانا آسان بات نہ تھی لیکن مجید کی جسمانی قوت کام آئی۔

اس نے ارشد کے پیچھے بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا دوسرے ہاتھ میں باگ تھام لی اور کہا ''سلیم! تم اگر وقت پر ڈاکٹر صاحب کو لے آئے تو تمہارے دوست کی جان بچ جائے گی۔''

سلیم نے بھاگ کر اپنے گھوڑے پر چھلانگ لگا دی لیکن چند قدم دور جا کر وہ مجید کی طرف مڑا اور کہنے لگا ''دیکھو مجید! یہ زخمی ہے، اسے احتیاط سے گھر پہنچانا میں ڈاکٹر صاحب کو لے کر ابھی آتا ہوں!''

مجید نے جواب دیا ''ارشد میرا بھی دوست ہے سلیم تم فکر نہ کرو، جلدی جاؤ!''

سلیم نے کسی توقف کے بغیر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

گھوڑا آندھی اور بارش کے سامنے اپنی گردن جھکائے پوری قوت کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔۔۔تاریکی ہر لحظہ بڑھ رہی تھی سلیم کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا رخ شہر کی طرف تھا وہ پگڈنڈی اور راستے سے بے نیاز ہو کر دھان اور مکئی کے کھیتوں کو عبور کر رہا تھا۔ جب گنے کے کھیت قریب آتے تو وہ کسی کھائی میں گھوڑا ڈال دیتا۔ قریباً ڈیڑھ میل اسی طرح طے کرنے کے بعد وہ شہر کی طرف جانے والی کچی سڑک تک پہنچ گیا۔



سلیم اپنی زندگی میں شاید پہلی بار انتہائی سنجیدگی، خلوص اور درد کے ساتھ ارض و سما کے اس مالک و مختار کے حضور میں التجائیں کر رہا تھا جو زندگی اور موت پر قادر ہے۔ ہر سانس کے ساتھ اس کے دل سے یہ دعائیں نکل رہی تھیں ''یا اللہ! ارشد کی جان بچا میرے مولی اس پر رحم کر۔ یہ میری غلطی تھی، اسے اس کی سزا نہیں ملنی چاہیے'' سلیم کو یقین تھا کہ خدا اپنے نیک بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے اس لیے وہ

کہہ رہا تھا ''یا اللہ! میں تیرا نیک بندہ بنوں گا میں آئندہ نماز اور روزہ قضا نہیں کروں گا میں ارشد کو بھی تیرا نیک بندہ بننے پر مجبور کروں گا۔ یا اللہ! اس کے ماں باپ اسے پیار کرتے ہیں اس کا چھوٹا بھائی اس کی ننھی بہنیں ہیں اگر وہ۔۔۔۔؟'' سلیم کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے اسے بارش، آندھی، کیچڑ اور پانی کا احساس تک نہ تھا۔ گھوڑا کئی بار گرتے گرتے بچا لیکن سلیم نے رفتار کم نہ کی۔

ارشد کے مکان کے قریب پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا۔ صحن کا پھاٹک اندر سے بند تھا۔ سلیم نے ''ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!!'' کہہ کر چند آوازیں دیں لیکن اس نے محسوس کیا کہ بارش اور آندھی کے شور میں اس کی آواز زیادہ دور نہیں جا سکتی۔ چند بار پھاٹک کو دھکا دینے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ پھاٹک کی سلاخوں میں ہاتھ ڈال کر اندر کی کنڈی کھول سکتا ہے۔ چنانچہ معمولی کوشش کے بعد اس نے کنڈی کھول لی اور اس کے بعد پھاٹک ہوا کے زور سے خود بخود کھل گیا۔ سلیم گھوڑے کی باگ پکڑے صحن میں داخل ہوا۔ کمروں کے اندر بجلی کے لیمپ روشن تھے اور دریچوں اور دروازے کے شیشوں سے روشنی برآمدے میں آ رہی تھی۔

''ڈاکٹر جی! ڈاکٹر جی!!'' سلیم نے آوازیں دیں۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے باہر نکل کر برآمدے کی بتی کا بٹن دباتے ہوئے کہا ''کون ہے؟''

یہ ارشد کا نوکر تھا سلیم کو اس نے ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا لیکن آج ایک تو وہ بری طرح کیچڑ میں لت پت تھا، دوسرے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ سلیم نے کہا''

ڈاکٹر جی کو بلاؤ!''

نوکر نے جواب دیا ''ڈاکٹر جی یہاں نہیں!''

''کہاں ہیں؟'' سلیم نے بدحواس ہو کر سوال کیا

''وہ یہاں سے تین کوس دور ایک گاؤں میں مریض کو دیکھنے گئے ہیں''

''تو میں وہاں جاتا ہوں! گاؤں کا نام کیا ہے؟''

''گاؤں کا نام۔۔۔۔بھئی مجھے یاد نہیں آتا۔ ارشد کو یاد تھا لیکن وہ بھی کہیں غائب ہے شاید وہ کہیں باہر سے ہی ڈاکٹر صاحب کیساتھ چلا گیا ہے۔ گھر کے لوگ بہت پریشان ہیں!''

سلیم نے ارشد کا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے کہا ''گھر سے پتہ کرو انہیں معلوم ہوگا۔''

''بھئی اول تو گھر والوں کو معلوم نہیں ہوگا اور اگر انہیں معلوم ہو بھی تو تم ایسے طوفان میں وہاں کیسے پہنچو گے اور پھر ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ آندھی اور بارش میں کیسے چل پڑیں گے۔ تم اندر آجاؤ۔ گھوڑے کو ستون کے ساتھ باندھ دو، شاید تھوڑی دیر میں مجھے نام یاد آجائے۔ بھلا سا نام ہے اس گاؤں کا۔ وہاں چودھری رحیم بخش رہتا ہے، وہ اسی کے علاج کے لیے گئے ہیں۔''

''ننگل والا چودھری رحیم بخش؟''

''ارے ہاں بھئی ننگل۔ بڑا ننگل!''

''میں جاتا ہوں!'' سلیم نے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔

”بھئی! میں نے تمہیں ارشد کے ساتھ کئی بار دیکھا ہے دیکھو اگر تم نکل جاؤ تو ڈاکٹر صاحب سے کہنا کہ اگر ارشد ان کے ساتھ ہے تو وہ گھر میں کسی کے ہاتھ پیغام بھیج دیں۔ گھر والے بہت پریشان ہیں!“

ارشد کی ماں نے باہر نکلتے ہوئے کہا ”کون ہے غلام علی!“

”جی ایک لڑکا ہے ڈاکٹر جی کو بلانے آیا تھا۔ اب ان کے پیچھے جا رہا ہے۔ میں نے اسے ارشد کے متعلق کہہ دیا ہے۔ اگر وہ وہاں ہوا تو ڈاکٹر صاحب ہمیں خبر کر دیں گے!“

ارشد کی ماں نے کہا ”ہاں بیٹا! یہ کام ضرور کرنا!“

”جی بہت اچھا!“

ارشد کی ماں نے ذرا آگے بڑھ کر بجلی کی روشنی میں غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ”بیٹا! تمہیں ایسے طوفان میں ڈر نہیں لگا۔ گھر میں کوئی بڑا آدمی نہیں تھا؟“

سلیم نے کوئی جواب نہ دیا ارشد کی ماں نے کہا ”تمہارا کون بیمار ہے؟“

سلیم نے متذبذب ہو کر جواب دیا ”جی میرے بھائی کو گھوڑے سے گر کر چوٹ آ گئی ہے!“

”اچھا بیٹا جاؤ! خدا اسے تندرستی دے“

سلیم نے کہا ”جی ارشد کے متعلق آپ فکر نہ کریں۔ اگر وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نہ ہوا تو پاس ہی ایک اور گاؤں میں اپنے ایک دوست کے ہاں ہو گا۔ میں صبح ہونے سے پہلے آپ کو اس کے متعلق اطلاع دوں گا!“

''تم ارشد کو جانتے ہونا؟''

''جی وہ میرے ساتھ پڑھتا ہے''سلیم نے یہ کہہ کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔کھیت، پگڈنڈیاں اور دیہاتی راستے پانی میں چھپے ہوئے تھے۔ہوا کی تیزی کسی حد تک کم ہو چکی تھی لیکن بارش اسی طرح تھی۔سلیم کو راستہ تلاش کرنے میں زیادہ دقت محسوس نہ ہوئی۔اس علاقے کا کوئی درخت ایسا نہ تھا جس کی تصویر اس کے ذہن پر نقش نہ تھی۔ اس آٹھ دس میل کے رقبے میں وہ اپنے گھوڑے پر کئی بار چکر لگا چکا تھا۔

جب وہ گاؤں میں داخل ہوا تو موسلا دھار بارش معمولی بوندا باندی میں تبدیل ہو چکی تھی۔تاہم گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔اس نے ایک مکان کے دروازے پر دستک دی اندر سے ایک کتاب بھونکنے لگا۔آس پاس کے مکانوں میں پناہ لینے والے کتوں نے اپنی اپنی جگہ سے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ادھیڑ عمر کا ایک آدمی دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

سلیم نے اس کے سوال کا انتظار کیے بغیر کہا''چودھری رحیم بخش کا مکان کہاں ہے؟''

''اسی گلی کے موڑ پر پکی ڈیوڑھی والا اسی کا مکان ہے!''

''بھئی ذرا میرے ساتھ چلو شہر سے ڈاکٹر صاحب ان کے گھر آئے ہوئے ہیں۔میں ان کی تلاش میں آیا ہوں!''

''چلو!''دیہاتی یہ کہہ کر سلیم کے آگے چل دیا۔ڈیوڑھی کے سامنے پہنچ کر اس نے کہا''یہ ہے ان کا مکان!''

ڈیوڑھی میں ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا، دیہاتی نے اس سے کہا۔ ’’بھئی فضل دین! ڈاکٹر صاحب یہیں ہیں نا؟‘‘

’’ڈاکٹر صاحب بیٹھک میں ہیں اور یہ گھوڑے پر کون ہے؟ آؤ بھئی! گھوڑا اندر لے آؤ! بارش میں کیوں کھڑے ہو!‘‘

سلیم نے کہا ’’نہیں مجھے جلدی ہے تم ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا دو!‘‘

’’تم انہیں لینے آئے ہو!‘‘

’’ہاں! ان کے لڑکے کو چوٹ آ گئی ہے۔ تم جلدی سے بلاؤ انہیں!‘‘

نوکر بھاگ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں لیمپ تھا اور اس کے پیچھے ڈاکٹر شوکت چلے آ رہے تھے!

’’کون ہے؟‘‘ ڈاکٹر نے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

سلیم نے کہا ’’ڈاکٹر جی آپ جلدی سے میرے ساتھ چلیں، ارشد زخمی ہے!‘‘

’’ارشد زخمی ہے! لیکن تم کون ہو؟‘‘

’’جی میں سلیم ہوں! ارشد آج ہمارے گاؤں آیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ گھوڑے پر سوار تھا کہ اس کا سر درخت سے ٹکرا گیا میں شہر سے ہو کر آیا ہوں!‘‘

’’اب کہاں ہے ارشد؟‘‘

’’جی وہ ہمارے گھر میں ہے آپ جلدی کیجئے‘‘

ڈاکٹر نے نوکر کی طرف متوجہ ہو کر کہا ’’بھئی تم جلدی سے میرے لیے چودھری صاحب کا گھوڑا تیار کر دو!‘‘

سلیم نے کہا" ڈاکٹر صاحب! گھوڑا تیار کرنے میں دیر ہو جائے گی، آپ میرے پیچھے بیٹھ جائیں، ہم ایک پل میں وہاں پہنچ جائیں گے ۔ارشد بیہوش ہے۔"

ڈاکٹر نے گھبرا کر کہا "ٹھہرو! میں اپنا تھیلا لے آؤں!"

ڈاکٹر صاحب نوکر کے ہاتھ سے لیمپ چھین کر اندر بھاگے اور آن کی آن میں اپنا تھیلا اٹھا لائے۔

"لائیے تھیلا مجھے دیجیے" سلیم نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے کچھ کہے بغیر تھیلا اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ سلیم نے گھوڑے کو ڈیوڑھی کی سیڑھی کے قریب لا کر کھڑا کر دیا اور ایک رکاب سے اپنا پاؤں نکالتے ہوئے کہا" آپ اس رکاب میں پاؤں رکھ کر میرے پیچھے بیٹھ جائیں!"

نوکر نے کہا" بھئی تم ڈاکٹر صاحب کو آگے بیٹھنے دو اور خود پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

سلیم نے کہا" ڈاکٹر صاحب اس وقت رستہ نہیں پہچان سکیں گے"

ڈاکٹر سلیم کے پیچھے سوار ہو گیا اور سلیم نے گھوڑے کو موڑ کر ایڑ لگا دی۔

ڈاکٹر نے کہا" بھئی! ذرا سنبھل کر چلو!"

"جی آپ فکر نہ کریں"

گاؤں سے نکلتے ہی ڈاکٹر صاحب کے مختلف سوالات کے جواب میں سلیم نے مختصراً ساری سرگزشت بیان کر دی۔

ڈاکٹر صاحب نے سوال کیا" کیا تم ہمارے گھر میں یہ بتا آئے ہو کہ ارشد زخمی ہے؟"

’’جی نہیں، ان کا خیال تھا کہ ارشد آپ کے ساتھ ہے۔ اس لیے میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔‘‘

’’تم نے بہت اچھا کیا!‘‘

بارش تھم چکی تھی اور بادلوں کی پھٹی ہوئی ردا سے کہیں کہیں تارے جھانک رہے تھے۔ مینڈکوں اور جھینگروں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ تھکا ہوا گھوڑا گردن جھکا کر اپنی بے بسی کا اظہار کر رہا تھا۔ تاہم جب بھی سلیم اسے ایڑ لگاتا، اس کی رفتار تیز ہو جاتی۔ گاؤں تک پہنچتے پہنچتے ڈاکٹر صاحب، سلیم کی طرح کیچڑ میں لت پت ہو چکے تھے۔

افضل گھر کے چند اور آدمیوں کے ساتھ دروازے سے باہر کھڑا تھا۔ اس نے گھوڑے کی آہٹ سنتے ہی دور سے آواز دی ’’سلیم! ڈاکٹر صاحب کو لے آئے؟‘‘

’’لے آیا ہوں چچا!‘‘ اس نے بلند آواز میں کہا۔

’’بہت دیر لگائی تم نے!‘‘

’’چچا یہ ننگل گئے ہوئے تھے۔ ارشد اب کیسا ہے؟‘‘

’’خدا کا شکر ہے کہ اسے ہوش آ گیا ہے۔‘‘

یہ ان سینکڑوں التجاؤں کا جواب تھا جو سلیم نے سارے راستے خدا سے کی تھیں افضل نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تو ارشد بستر پر لیٹا ہوا تھا اور سلیم کی ماں اس کا سر اپنی گود میں لے کر اسے پنکھے سے ہوا دے رہی تھی۔ گھر کی لڑکیاں اور عورتیں اس کے

گرد جمع تھیں۔

افضل کے اشارے سے تمام عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ارشد نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور نادم سا ہو کر آنکھیں جھکا لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے اس کے قریب بیٹھے ہوئے کہا ''شہسوار بننا آسان نہیں بیٹا!''

جب ڈاکٹر صاحب ارشد کے سر پر پٹی باندھ رہے تھے، سلیم نہانے کے بعد کپڑے بدل کر مسجد کا رخ کر رہا تھا۔

نماز کے بعد جب وہ ارشد کے کمرے میں داخل ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا! کہاں گئے تھے تم؟''

''جی میں نماز پڑھنے گیا تھا۔''

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کے دادا کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''چودھری جی! آپ کا پوتا بہت بہادر ہے۔ جب اس نے کہا کہ میں شہر سے ہو کر آیا ہوں تو مجھے یقین نہیں آتا تھا۔''

''یہ افضل کا شاگرد ہے گھوڑے کے سوا اسے کسی چیز سے انس نہیں۔ خدا آپ کے بچے کو شفا دے، میں بہت پریشان تھا۔ اب کوئی خطرہ تو نہیں ڈاکٹر صاحب؟''

''نہیں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ تاہم کل اور پرسوں کا دن اسے آپ کا مہمان رہنا پڑے گا۔ تیسرے دن میں اسے گھر لے جاؤں گا!''

''نہیں ڈاکٹر صاحب! یہ بات نہیں ہو گی۔ آپ کا بچہ تندرست ہونے تک ہمارے پاس رہے گا۔ سلیم کی دادی نے اس کے تندرست ہونے پر ایک بکرے کی

نیاز دینے کی منت مانی ہے۔ آپ اپنے بال بچوں کو یہیں منگوا لیں۔ ہم اپنے مکان کا ایک حصہ ان کے لیے خالی کر دیں گے، آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ اگر آپ کو ہسپتال سے چھٹی نہ ملے تو ہمارا ایک گھوڑا آپ کے پاس رہے گا۔ آپ اسے دن میں دو بار دیکھ جایا کریں۔"

افضل نے کہا "ڈاکٹر صاحب! ارشد کے متعلق آپ کے گھر میں بہت پریشانی ہو گی۔ اگر آپ ان کی تسلی کے لیے رقعہ لکھ دیں تو میں ابھی بھجوا دیتا ہوں!"

ڈاکٹر نے کہا "آپ کا بھتیجا بہت سمجھدار ہے۔ اس نے وہاں ارشد کے زخمی ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ بہر حال وہ اس کی غیر حاضری سے پریشان ہوں گے۔"

سلیم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نے ارشد کی امی سے وعدہ کیا تھا کہ میں صبح سویرے انہیں اس بات کا پتہ دوں گا کہ ارشد کہاں ہے۔ آپ اگر رقعہ لکھ دیں تو میں سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچا دوں گا!"

"تم تھک گئے ہو گے بیٹا!" ڈاکٹر صاحب نے شفقت آمیز لہجے میں کہا۔

سلیم کی بجائے افضل نے جواب دیا "جب دوست کی زندگی کا سوال ہو تو تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر صاحب نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "اچھا بیٹا! میں تمہیں رقعہ لکھ دیتا ہوں۔ میرے تھیلے میں کچھ دوائیاں ہیں جن کی یہاں ضرورت ہے۔ ارشد کی ماں تمہیں وہ تھیلا دے دے گی اسے احتیاط سے لے آنا۔ اگر ارشد کی ماں یہاں آنے پر ضد کرے تو اسے کہنا کہ میں کوئی آٹھ نو بجے گھر پہنچ جاؤں گا اور شام کو انہیں اپنے

ساتھ لے آؤں گا!''

چودھری رحمت علی نے کہا'' مجھے یقین ہے کہ وہ سلیم کے ساتھ آ جائیں گی سلیم! تم مجید کو بھی ساتھ لے جاؤ، اگر وہ تمہارے ساتھ تیار ہو جائیں تو انہیں گھوڑوں پر بٹھا لینا اور خود باگ پکڑ کر ساتھ آنا۔''



چودھری رحمت علی کا قیاس صحیح ثابت ہوا۔ علی الصباح ارشد کی ماں اپنے خاوند کا رقعہ پڑھنے اور سلیم اور مجید سے چند سوالات پوچھنے کے بعد بچوں سمیت ان کے ساتھ آنے پر تیار ہو گئی۔ ارشد کا چھوٹا بھائی امجد اپنی ماں کے ساتھ مجید کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور باقی دو لڑکیاں عصمت اور راحت سلیم کے گھوڑے پر بیٹھ گئیں۔ سلیم اور مجید ان گھوڑوں کی باگیں پکڑ کر ان کے آگے آگے چل پڑے اور نوکر دوا کا تھیلا اٹھا کر ان کے پیچھے ہو لیا۔

راستے میں ارشد کی ماں نے سلیم سے کہا'' بیٹا تمہارا گھوڑا بہت خوفناک معلوم ہوتا ہے کہیں اس کی باگ نہ چھوڑ دینا!''

''جی آپ فکر نہ کریں یہ گھوڑا مجھے چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔''

''بیٹا! پھر بھی اس کی باگ احتیاط سے پکڑنا، جانور کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔''

''جی آپ فکر نہ کریں!''

کچھ دیر ارشد کی ماں مجید اور سلیم سے ارشد کے متعلق پوچھتی رہی۔ عصمت نے

مڑ کر راحت کے کان میں کچھ کہا اور اس نے ماں سے شکایت کی۔

''امی عصمت کہتی ہے یہ گھوڑا مجھے کھا جائے گا۔''

مجید اور سلیم ہنس پڑے عصمت کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گے ا اور اس نے راحت کے بازو پر چٹکی لی وہ چلائی ''امی عصمت مارتی ہے۔''

''کیا کرتی ہو عصمت؟'' ماں نے جھڑک کر کہا

عصمت کی عمر نو سال تھی راحت اس سے تین سال چھوٹی تھی اور امجد نے ابھی چوتھے برس میں پاؤں رکھا ہی تھا۔ ماں سے جھڑکی کھانے کے بعد عصمت کچھ دیر خاموش رہی اور پھر راحت کے کان میں کہنے لگی ''ان کے گاؤں میں بھوت ہوتے ہیں۔''

''تم جھوٹ کہتی ہو'' راحت نے بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا

راحت نے قدرے فکرمند ہو کر سوال کیا '' بھلا تمہارے گاؤں میں بھوت ہوتے ہیں؟''

''نہیں'' سلیم نے جواب دیا

''شیر ہوتے ہیں؟''

''شیر بھی نہیں ہوتے''

راحت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سوال کیا

''سانپ ہوتے ہیں؟''

عصمت نے دبی زبان سے کہا'' گاؤں میں بہت بڑے بڑے بڑے سانپ

ہوتے ہیں وہ بچوں کو کھا جاتے ہیں!''

راحت نے پھر اپنی ماں سے فریاد کی ''امی آپا کہتی ہے، مجھے سانپ کھا جائے گا۔ میں گاؤں میں نہیں جاؤں گی!''

ماں نے عصمت کو ایک جھڑکی اور دی سلیم نے راحت کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''سانپ گاؤں میں نہیں آتے!''

راستے میں برساتی نالہ آیا تو عصمت نے کہا ''اب تم ڈوب جاؤ گی!''

''بھلا میں ڈوب جاؤں گی؟'' راحت نے فکرمندسی ہو کر سلیم سے سوال کیا۔

''نہیں، یہ پانی زیادہ گہرا نہیں۔ تمہاری بہن تمہیں یونہی ڈرا رہی ہے۔''



ارشد کی والدہ اور بچے سلیم کے گھر کے ماحول سے جلد ہی مانوس ہو گئے۔ سلیم کا چھوٹا بھائی یوسف، امجد کو اپنے ساتھ لے کر اپنی عمر کے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ عصمت اور راحت کو امینہ، صغریٰ اور زبیدہ جیسی سہیلیاں مل گئیں۔

ارشد کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہہ چکے تھے کہ اس کی حالت تسلی بخش ہے اور وہ دوپہر کے بعد واپس آنے کا وعدہ کر کے شہر چلے گئے۔

زبیدہ کے اصرار پر سلیم نے باہر کی حویلی میں درخت کے ساتھ جھولا ڈال دیا اور لڑکیاں وہاں جمع ہو گئیں۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ ارشد کے ساتھ زیادہ باتیں نہ کی جائیں، اس لیے سلیم کی ماں نے اس بات کا خیال رکھا کہ گاؤں کی

عورتیں اس کے گرد جمع نہ ہوں۔ وہ خود ارشد کی ماں کے ساتھ سارا دن ارشد کے پاس بیٹھی رہی سلیم کے لیے خاموش رہنے کا یہ حکم بہت صبر آزما تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا اور تھوڑی دیر خاموش بیٹھ کر پھر باہر نکل جاتا۔ جتنی دیر وہ کمرے میں رہتا، ارشد کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز رہتیں۔

عصر کے وقت سلیم اس کے کمرے سے نکل کر نماز کے لیے جا رہا تھا تو ارشد نے نحیف آواز میں کہا ''سلیم!''

سلیم مڑ کر اس کے بستر کے پاس کھڑا ہو گیا۔ ارشد نے کہا ''کہاں جا رہے ہو! بیٹھ جاؤ!''

سلیم نے اس کے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا ''میں نماز کے لیے جا رہا تھا!''

ارشد نے اس کے ہاتھ پکڑ کر دباتے ہوئے کہا ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں، رات کو مجھے کہانی سناؤ گے؟''

سلیم اب کہانی سنانے کے مطالبہ پر چڑا کرتا تھا لیکن ارشد کی درخواست پر اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا ''سناؤں گا!''

رات کے وقت آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندیں گر رہی تھیں کمرے کے اندر حبس تھا، اس لیے ارشد کو برآمدے میں لٹا دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب جو شام کے وقت واپس آ گئے تھے، کھانا کھانے کے بعد گھر کے آدمیوں کے ساتھ باہر کی حویلی کے کشادہ برآمدے میں لیٹ گئے۔

سلیم نے عشاء کی نماز کے بعد ارشد کے قریب بیٹھ کر کہانی شروع کر دی۔ ایک،

صغریٰ، زبیدہ اور ارشد کی بہنیں برآمدے کے دوسرے سرے پر چارپائیوں پر بیٹھی آپس میں باتیں کر رہی تھیں اچانک زبیدہ کے کان میں سلیم کی آواز پڑی اور اس نے کہا ''امینہ بھائی جان کہانی سنا رہے ہیں!''

آن کی آن میں امینہ،صغریٰ اور زبیدہ سلیم کے گرد جمع ہو گئیں۔رضیہ کہہ رہی تھی'' بھائی جان ہم بھی سنیں گے،شروع سے سناؤ!''

صغریٰ نے کہا'' آؤ عصمت تم بھی یہاں آجاؤ۔ بھائی سلیم بڑی اچھی کہانیاں سنایا کرتے ہیں۔''

سلیم نے کچھ دیر ٹال مٹول کی لیکن جب عصمت اور راحت بھی اس کے قریب آ گئیں تو اس سے انکار کرتے نہ بنی اس نے کہا'' اچھا تم میں سے کسی نے شور مچایا تو پیٹوں گا!''

راحت نے معصومانہ انداز میں کہا'' مجھے پیٹو گے تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی''

سلیم کی ماں اور چچیاں جو ارشد کے دوسری طرف چارپائیوں پر بیٹھی ہوئی آپس میں باتیں کر رہی تھیں، ہنس پڑیں

سلیم نے کہا''تمہیں نہیں پیٹوں گا آؤ تم یہاں بیٹھ جاؤ!''

راحت بے تکلفی سے سلیم کے قریب بیٹھ گئی امینہ ایک چارپائی گھسیٹ کر سلیم کے قریب لے آئی اور باقی لڑکیاں اس پر بیٹھ گئیں۔

سلیم نے کہانی شروع کی کچھ عرصہ سے وہ مجبوری کی حالت میں کبھی کبھی اپنی بہنوں کو ٹالنے کے لیے مختصر سی کہانی سنا دیا کرتا تھا۔لیکن آج مدت کے بعد وہ اس

کام میں دلچسپی لے رہا تھا۔شروع شروع میں اسے اس بات کا احساس تھا کہ ارشد شاید اس کہانی میں دلچسپی نہ لے، اس لیے اس نے چند بار باقی اگلی شب سنانے کا وعدہ کرکے کہانی ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ارشد ہر مرتبہ کہہ دیتا نہیں بھئی! ساری سناؤ!

سلیم کا عصمت کے متعلق بھی یہ خیال تھا کہ وہ اپنے بھائی کی طرح ذہین ہے۔ کہانی شروع کرنے سے پہلے وہ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز تبسم دیکھ رہا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ سب سے زیادہ متاثر ہے۔

سلیم کی کہانی کا شہزادہ کسی صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور لیمپ کی روشنی میں عصمت کی معصوم نگاہیں یہ کہتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں کہ کاش میں اسے پانی پلا سکتی۔سلیم کی کہانی کا خونخوار آدمی سوئے ہوئے شہزادے کو زنجیروں میں جکڑ رہا تھا اور عصمت کے چہرے کا حزن و ملال اس احساس کی ترجمانی کر رہا تھا کہ کاش کوئی اسے جگا دے اور جب کوئی نیک دل انسان شہزادے کی زنجیریں کھول رہا تھا تو اس کا خوبصورت چہرہ مسرتوں کا گہوارہ بن رہا تھا۔

کہانی کا جو اختتام سلیم کے ذہن میں تھا، وہ بہت دردناک تھا۔شہزادہ شادی کے دن گھوڑے سے گر کر مر جاتا تھا اور شہزادی اس کا جنازہ دیکھ کر محل سے چھلانگ لگا دیتی تھی لیکن سلیم کو عصمت کا لحاظ کرنا پڑا۔شہزادہ گھوڑے سے گرتے گرتے سنبھل گیا اور شہزادی کو محل سے گرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔

سلیم نے کہانی ختم کی تو لڑکیوں نے ایک اور کہانی کا مطالبہ کیا لیکن سلیم کی ماں نے کہا ''نہیں دوسری کہانی کل سن لینا۔ اب ارشد کو آرام کرنے دو۔''

سلیم بالا خانے پر جا کر لیٹ گیا باہر کی حویلی میں آدمیوں کی محفل گرم تھی اور چچا اسماعیل کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ مجید وہاں ہوگا، سلیم کے دل میں وہاں جانے کا خیال آیا لیکن تھکاوٹ کے احساس سے وہ بستر پر پڑا رہا۔ اسے جلد ہی نیند آ گئی تھوڑی دیر میں وہ سپنوں کی حسین وادی میں پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک شہزادہ تھا اور ایک حسین شہزادی کو درندوں کے نرغے سے چھڑا رہا تھا۔ شہزادی کو ایک خوفناک جن نے اٹھا کر ایک ایسے پہاڑ کی چوٹی پر رکھ دیا تھا جہاں پہنچنے کے تمام راستے مسدود تھے اور وہ ہوا میں اڑ کر وہاں پہنچ رہا تھا۔

وہ صحرا میں پیاس سے تڑپ رہا تھا اور شہزادی اس کے لیے پانی لے کر آ رہی تھی اور اس شہزادی کی شکل وصورت اس لڑکی سے ملتی تھی جو رات کے وقت ہمہ تن گوش بن کر اس سے کہانی سن رہی تھی۔

صبح ہوئی تو اس نے نیم خوابی کی حالت میں محسوس کیا کہ کوئی اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا ہے وہ چونک کر اٹھا امینہ پانی کا لوٹا لیے کھڑی تھی۔

''امینہ کی بچی ٹھہرو۔۔۔۔۔!'' وہ غضب ناک ہو کر اٹھا لیکن اس کے پیچھے زبیدہ اور عصمت کو دیکھ کر اس کا غصہ جاتا رہا۔

امینہ نے کہا ''واہ جی، نیکی کرو تو گالیاں ملتی ہیں۔ نماز کا وقت جا رہا تھا اور تم مزے سے خراٹے لے رہے تھے۔''

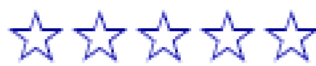
سلیم نے کچھ کہے بغیر اس کے ہاتھ سے پانی کا لوٹا لے لیا۔ باہر جاتے جاتے اس نے ایک لمحہ کے لیے رک کر عصمت کی طرف دیکھا اور اسے اپنے سپنوں کی شہزادی یاد آ گئی۔

چھ دن بعد ارشد کو اس کا باپ اپنے گھر لے گیا۔ ارشد کی ماں نے رخصت ہوتے وقت سلیم کی ماں اور اس کی چچیوں سے وعدہ لیا کہ وہ کبھی کبھی ان کے گھر آیا کریں گی۔ امینہ، صغریٰ اور زبیدہ سے رخصت ہوتے وقت عصمت اور راحت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سلیم کی دادی کو یہ وعدہ کرنا پڑا کہ وہ ان کی سہیلیوں کو کبھی کبھی مجید اور سلیم کے ساتھ شہر بھیج دیا کریں گی۔

اس کے بعد ارشد کی ماں دو تین ہفتوں میں ایک بار ضرور سلیم کے گھر آتی، اگر اسے دیر ہو جاتی تو سلیم کی ماں اور چچیاں لڑکیوں کے ساتھ شہر چلی جاتیں۔

ارشد کو اس کے باپ نے بائیسکل خرید دی تھی، اس لیے وہ قریباً ہر اتوار اس کے گاؤں آ جاتا اور جب وہ نہ آتا، سلیم گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے گھر چلا جاتا۔

مجید چھٹی کے دن گاؤں کے لڑکوں کے سات کبڈی کھیلا کرتا تھا، کشتی لڑا کرتا تھا اور افضل سے گتکا سیکھا کرتا تھا۔ اسے سلیم کے مشاغل سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔



فروری کے آخری دن تھے وہ درخت جنہیں خزاں نے سبز پتوں سے محروم کر دیا تھا، سرخ کونپلوں کے زیور سے آراستہ ہو رہے تھے۔ آلوچہ، ناشپاتی اور آڑو کے

درختوں کی شاخیں پھولوں میں چھپ رہی تھیں۔ بیریوں کی شاخیں پھل کے بوجھ سے جھک رہی تھیں کھیتوں میں گندم لہلہا رہی تھی۔ سرسوں پھول رہی تھی، خالی کھیتوں میں انواع واقسام کی گھاس، پودے اور بیلیں اگ رہی تھیں۔ غرض کوئی جگہ ایسی نہ تھی جو موسم بہار کے سبز لبادے سے محروم ہو۔ خودرو پودوں اور بیلوں میں رنگا رنگ کے پھول مسکرا رہے تھے۔ ننھے ننھے سرخ پھول جن کی زندگی فقط ایک آفتاب کے طلوع وغروب تک محدود ہوتی ہے، جو گھاس کی سبز چادر پر یاقوت، زمرد، نیلم اور عقیق کے نگینے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ مصور فطرت کی وہ ننھی اور دلفریب تصویریں ہیں، جن کے رنگ اور مہک کی تخصیص کے لیے انسان نے ابھی تک جدا جدا الفاظ ایجاد نہیں کیے۔ ان میں ہر ایک دیکھنے والوں سے اپنی خاموش زبان میں کہہ رہا ہے۔۔۔ ''میری طرف دیکھو، مجھے سونگھو، مجھے چوم لو، تم کہاں بھٹک رہے ہو؟ تم کس کے متلاشی ہو؟ میری زندگی مختصر ہے لیکن تمہارے لیے میں ایک حقیقتِ ابدی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے کسی نے بنایا ہے کسی نے رنگینی، رعنائی اور مہک عطا کی ہے۔ میں تمہارے سامنے کائنات کے اس خالق اکبر کا پیغام لے کر آیا ہوں جس کے حکم سے ہوائیں چلتی ہیں، بادل آتے ہیں، مینہ برستا ہے اور زمین اپنی گود میں چھپے ہوئے خزانے اگلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان ہاتھوں کو پہچانو! جنھوں نے مجھے زمین کی تاریک گود سے باہر نکالا ہے، جن کی لوریوں نے مجھے مسکراہٹیں عطا کی ہیں۔ یہی ہاتھ ہیں جو رات کے وقت آسمان پر تاروں کی قندیلیں روشن کرتے ہیں اور صبح کے وقت سورج کے چہرے سے نقاب الٹ دیتے ہیں۔ تم کہاں بھٹک رہے

ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ میری طرف دیکھو!"

یہ وہ موسم تھا جب سلیم کی تمام دلچسپیاں اپنے گاؤں میں مرکوز ہو جایا کرتی تھیں۔ وہ علی الصباح اٹھتا اور نماز کے بعد سیر کے لیے باہر نکل جاتا۔ گاؤں سے باہر کسی کھیت میں کھڑا ہو کر وہ پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کے عقب سے طلوع آفتاب کا منظر دیکھتا۔ شبنم میں دھلے ہوئے پھول توڑتا۔ فضا میں مرغابیوں کی ڈاریں بیاس کے کنارے جھیلوں کا رخ کرتی نظر آتیں۔ مور کھیتوں میں مچلنے کے لیے گھنے باغات سے باہر نکل آتے۔ ان دلکش مناظر کی سیر کے بعد وہ اچھلتا کودتا اور بھاگتا ہوا گھر پہنچتا اور کھانا کھانے کے بعد اسکول روانہ ہو جاتا۔

ایک اتوار سلیم گھر پر ارشد کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ حسب وعدہ نہ آ سکا۔ اگلے دن سلیم اسکول گیا تو ارشد اسے فکر مند دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا "کیوں ارشد! تمہیں کسی نے پیٹا ہے؟"

ارشد نے کوئی جواب نہ دیا۔

"دیکھو بھئی! پچھلے اتوار تم ہمارے گاؤں نہیں آئے تھے، اس اتوار ضرور آنا!"

ارشد نے جواب دینے کی بجائے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں سے سلیم کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیم نے فکر مند ہو کر سوال کیا "ارشد کیا بات ہے گھر میں خیریت ہے نا؟"

اس نے جواب دیا "سلیم! ابا جان کی تبدیلی ہو گئی ہے ہم پرسوں جا رہے ہیں؟"

"کہاں؟" سلیم نے مضطرب ہو کر سوال کیا

''امرتسر!''

سلیم دیر تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اتنے میں اسکول کی گھنٹی بج گئی اور دعا کے بعد وہ کلاس روم میں چلے گئے استاد آئے اور اپنا اپنا مضمون پڑھا کر چلے گئے لیکن سلیم کے ذہن میں بار بار امرتسر کا لفظ گھوم رہا تھا۔کبھی کبھی وہ اس بات کا سہارا لے کر ارشد کی طرف دیکھتا کہ شاید اس نے مذاق کیا ہو لیکن ارشد کے چہرے کا حزن وملال اس خیال کی تردید کر دیتا۔

جب چھٹی ہوئی اور لڑکے اپنے بستے اٹھا کر باہر نکل گئے تو ارشد اور سلیم اپنا اپنا بستہ باندھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔مجید اور باقی ساتھی باہر کھڑے سلیم کا انتظار کر رہے تھے۔

مجید نے دروازے میں کھڑے ہو کر آواز دی ''آؤ سلیم!نہیں تو ہم جاتے ہیں!''

''آتا ہوں!''سلیم نے یہ کہہ کر بستہ اٹھا لیا لیکن دو تین قدم چلنے کے بعد رک کر ارشد کی طرف دیکھنے لگا۔

ارشد نے کہا''ہمارے گھر نہیں چلو گے؟امی جان نے تمہیں بلایا ہے!''

''چلو!''

ارشد اور سلیم باہر نکلے تو مجید نے کہا''تمہاری باتیں ہی ختم نہیں ہوتیں؟''

سلیم نے کہا''مجید میں ذرا ارشد کے گھر جا رہا ہوں!''

''مجھے پہلے ہی معلوم تھا''

ارشد نے کہا ''امی جان سلیم کے ہاتھ کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہیں، چلو تم بھی!''

مجید نے گاؤں کے ایک کھیت میں تلیر پکڑنے کے لیے پھندا لگا رکھا تھا اور اسے شام سے پہلے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔ اس نے کہا ''نہیں بھئی ہم جاتے ہیں''

سلیم ارشد کے ساتھ اس کے گھر کی طرف چل دیا۔ پھاٹک کے قریب پہنچ کر ارشد نے کہا ''تم ذرا ٹھہرو! میں تمہیں تماشا دکھاتا ہوں''

سلیم دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ارشد مسکراتا ہوا داخل ہوا اس کی ماں کرسی پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی اس نے ارشد کو دیکھتے ہی کہا ''بیٹا! میں نے تمہیں کہا تھا کہ سلیم کو ساتھ لے کر آنا؟''

''امی جان وہ نہیں آیا!'' ارشد نے مغموم چہرہ بناتے ہوئے جواب دیا

''تم نے اسے بتایا نہیں کہ ہم جا رہے ہے؟''

''بتایا تھا لیکن وہ نہیں آیا!''

عصمت نے جلدی سے باہر نکلتے ہوئے کہا ''امی، بھائی جان اسے کہتے تو وہ ضرور آتا انہوں نے کہا ہی نہیں ہو گا!''

ارشد بولا ''وہ کہتا تھا کہ عصمت چڑیل ہے، مجھے تنگ کرتی ہے میں نہیں جاؤں گا!''

''آپا چڑیل! چڑیل!!'' راحت نے تالی بجاتے ہوئے کہا

''تم جھوٹ کہتے ہو، وہ مجھے چڑیل نہیں کہہ سکتا۔''

''اگر وہ تمہارے منہ پر کہہ دے کہ تم چڑیل ہو تو پھر مان لو گی؟''

ارشد کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر عصمت پھاٹک کی طرف بھاگی، سلیم اسے دیکھ کر ہنس پڑا۔ عصمت منہ بسورنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

سلیم نے اپنا بستہ اس کے سر پر رکھ دیا اور وہ منہ دوسری طرف پھیر کر ہنسی ضبط کر رہی تھی۔

''دیکھو کہیں گرا نہ دینا میری سلیٹ ٹوٹ جائے گی!'' سلیم نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ اٹھالیا۔ عصمت ایک ثانیے کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہی لیکن جب بستہ گرنے لگا تو دونوں ہاتھوں سے اسے تھام کر ہنسنے لگی۔

سلیم نے آگے بڑھ کر ارشد کی ماں کو سلام کیا۔

''جیتے رہو بیٹا! بیٹھ جاؤ!'' ماں نے سرکنڈے کے مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔ سلیم بیٹھ گیا۔ راحت نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا ''آپ چڑیل ہے نا؟''

سلیم نے جواب دیا ''نہیں! چڑیل کے بال بکھرے رہتے ہیں اور وہ جوتا بھی نہیں پہنتی!''

راحت نے پریشان ہو کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اور ماتھے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

ماں نے کہا ''عصمت جاؤ، سلیم کے لیے گاجر کا حلوہ لے آؤ!''

ارشد نے ایک کونے سے تپائی اٹھا کر سلیم کے سامنے رکھ دی اور کرسی گھسیٹ کر

اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''بیٹا چائے بنواؤں؟''

''نہیں جی!''سلیم نے جواب دیا

عصمت نے حلوے کی پلیٹ لا کر تپائی پر رکھ دی ماں بولی''بیٹا! مجید کو بھی لے آتے!''

ارشد نے کہا''میں نے تو کہا تھا لیکن وہ نہیں آیا!''

سلیم نے کہا''اس نے تلیر پکڑنے کے لیے پھندا لگا رکھا ہے، شام کو بہت تلیر پھنستے ہیں۔اس لیے اسے وہاں پہنچنے کی فکر تھی۔''

امجد صحن میں اپنے ایک ہم عمر کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا وہ پہلی بار سلیم کی طرف متوجہ ہوا''مجھے بھی ایک تلیر لا دو گے نا؟''

''لا دوں گا!''سلیم نے جواب دیا اور امجد پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گیا۔

ارشد کی ماں نے کہا''بیٹا ارشد نے تمہیں بتایا ہو گا کہ اس کے ابا جان امرتسر تبدیل ہو گئے ہیں!''

''جی ہاں!''

''انہوں نے دس دن کی چھٹی لی تھی اور ہمارا خیال تھا کہ جانے سے پہلے ہم سب دو تین دن تمہارے گاؤں رہیں گے اس کے بعد میں تمہاری ماں اور چچیوں کو یہاں آنے کی دعوت دوں گی لیکن جالندھر میں ارشد کے ماموں کی شادی ہے اور ہم پرسوں وہاں جا رہے ہیں۔اب میں کل صبح تک تمہارے گاؤں آؤں گی اور شام کو

واپس چلی آؤں گی!''

عصمت بولی ''امی جان! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی!''

''ہم سب چلیں گے ارشد کے ابا سامان وغیرہ بندھوانے میں مصروف ہوں گے اس لیے شاید وہ نہ جاسکیں۔''

سلیم نے کہا ''میں گھوڑے لے آؤں گا!''

''نہیں ہم تانگے پر آئیں گے سڑک پر ہم تانگہ چھوڑ دیں گے اور وہاں سے پیدل چلیں گے واپسی پر پھر سیر کرتے آئیں گے!''

شام کے قریب سلیم نے ارشد کی امی سے اجازت لی اور اپنے گاؤں کی طرف چل دیا۔ مغربی افق پر سورج جھک کر زمین کے کنارے کو چھو رہا تھا اور شفق کی سرخی کا عکس کانگڑہ کے پہاڑوں پر پھیل رہا تھا۔ چوٹیوں پر برف کے تودے سونے کے انبار نظر آتے تھے۔ چہچہاتے ہوئے پرندوں کے غول اپنے آشیانوں کا رخ کر رہے تھے۔ مرغابیاں، سرخاب اور کونجیں علیحدہ علیحدہ قطاروں میں کسی نامعلوم منزل کی طرف پرواز کر رہی تھیں۔ موروں کی ٹولیاں گندم، چنے اور سرسوں کے کھیتوں سے نکل نکل کر درختوں پر جمع ہو رہی تھیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا لیکن اس کی الوداعی مسکراہٹیں ابھی تک برفانی پہاڑ کی چوٹیوں پر رقص کر رہی تھیں۔

سلیم نے راستے میں ایک رہٹ پر وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر بستہ اٹھا کر چل دیا۔ پگڈنڈی پر ایک خرگوش اسے دیکھ کر بھاگا لیکن اس نے کوئی دل چسپی نہ لی۔

نالے کے کنارے سارس کا جوڑا منہ اٹھائے کھڑا تھا لیکن اس نے توجہ نہ کی، وہ پریشان تھا۔ ارشد جارہا تھا، امجد جارہا تھا، عصمت اور راحت جارہی تھیں اس کی زندگی کی معصوم مسکراہٹیں چھن رہی تھیں۔



اگلے دن وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر سڑک کے کنارے کھڑا تھا جب وہ ٹانگے کا انتظار کرتے کرتے اکتا گیا تو سرسوں کے پھول توڑنے لگا۔ اس نے تین گلدستے بنائے سب سے بڑا عصمت کے لیے، اس سے چھوٹا راحت کے لیے اور سب سے چھوٹا امجد کے لیے پھر کچھ سوچ کر سب سے بڑا گلدستہ اٹھایا اور ننھی ننھی بیلوں اور پودوں سے مختلف رنگوں کے پھول توڑ کر اس میں لگانے شروع کر دیے۔ گلدستے زمین پر رکھ کر وہ پگڈنڈی کے قریب بیٹھ گیا۔ اور جیب سے چاقو نکال کر زمین کھودنے لگا۔ کوئی ایک بالشت گہرا گڑھا کھودنے کے بعد اس نے اسے پھر مٹی سے بھر دیا اور اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا چند مسافر سڑک پر سے گزر رہے لیکن حد نگاہ تک تانگے کا نام ونشان نہ تھا وہ مایوس سا ہو کر پھر بیٹھ گیا اور چاقو کے ساتھ پگڈنڈی کی ہموار سطح پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچنے لگا۔ سرسوں کے پھولوں کی تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن مختلف رنگوں کے وہ نرم اور نازک پھول جو اس نے عصمت کے گلدستے میں جمع کیے تھے۔ مرجھا رہے تھے سلیم نے اپنے اردگرد تمام جگہ لکیروں سے بھر دی۔ پھر ایک صاف جگہ منتخب کر کے بیٹھ گیا اب وہ لکیریں کھینچنے اور

دائرے بنانے کی بجائے مختلف نام لکھ رہا تھا۔ اپنے نام کے بعد اس نے ارشد، مجید اور سکول کے باقی دوستوں کے نام لکھ دیے۔ پھر اسے پرائمری سکول کے ساتھی یاد آ گئے اور وہ ان کے نام لکھنے لگا۔ یہ جگہ بھر گئی تو وہ کھسک کر اور آگے ہو گیا اس نے گلدستے میں چند مرجھائے ہوئے پھولوں کو دیکھا اور زمین پر ایک اور نام لکھ دیا وہ نام جس کی اہمیت وہ پہلی بار شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا ''عصمت'' کے لفظ کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے معصوم مسکراہٹیں رقص کر رہی تھیں۔ اس کے کانوں میں لطیف قہقہے گونج رہے تھے۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے وہ تمام دوست جن کے نام وہ پہلے لکھ چکا تھا اس کی اس حرکت پر ہنس رہے ہیں اس نے جلدی سے ہاتھ پھیر کر ''عصمت'' کا نام مٹا دیا اور اٹھ کر شہر کی طرف دیکھنے لگا کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تانگہ آ رہا تھا اور وہ جلدی سے جھک کر باقی ناموں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

تانگہ قریب آ گیا تو اس نے پھولوں کے گلدستے اٹھا لیے لیکن پھر کچھ سوچ کر بڑا گلدستہ گندم کے پودوں میں چھپا دیا تانگہ پگڈنڈی کے پاس آ کر رکا امجد اور راحت نے اترتے ہی اس کے ہاتھ سے گلدستے چھین لیے اور عصمت قدرے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

راحت نے کہا ''آپا کو بھی پھول توڑ دو نا!''

''میں پھول نہیں لوں گی'' عصمت نے منہ بسورتے ہوئے کہا

ارشد کی ماں نے کہا ''بیٹا! تم کب سے یہاں کھڑے ہو؟''

''میں بہت دیر سے یہاں کھڑا ہوں!''

ارشد بولا ”ہمیں دیر ہو گئی میرا خیال تھا کہ تم گھوڑے پر شہر پہنچ جاؤ گے!“

سلیم نے کہا اگر میں یہاں تک پیدل نہ آیا ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتا!

ارشد کی ماں نے کوچوان سے کہا ”اب تم جاؤ! شام کو ہم پیدل آ جائیں گے!“

ارشد امجد کی انگلی پکڑ کر آگے آگے ہو لیا اور اس کی ماں، راحت اور عصمت اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ سلیم نے کھیت میں چھپایا ہوا گلدستہ اٹھایا اور دبے پاؤں آگے بڑھ کر عصمت کے سر پر رکھ دیا۔ عصمت پہلے چونکی، اس کے بعد اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور پھر گلدستے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر ہنسنے لگی۔

اب وہ راحت کو چڑا رہی تھی ”دیکھو تمہارا گلدستہ چھوٹا ہے اور میرا بڑا ہے، تمہارے ایک رنگ کے پھول ہیں اور میرے کئی رنگ کے ہیں!“

راحت کچھ دیر صبر کے ساتھ ہنستی رہی لیکن بالآخر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ گلدستہ پھینک کر پگڈنڈی پر بیٹھ گئی ارشد اور اس کی ماں ہنس رہے تھے اور سلیم اسے منا رہا تھا ”دیکھو بھئی! آگے بہت پھول ہیں، میں تمہیں اس سے بھی بڑا گلدستہ بنا دوں گا!“

”مجھے لال رنگ کے پھول بھی توڑ کے دو گے نا!“ راحت نے اٹھتے ہوئے کہا

”وہ بھی توڑ دوں گا!“

اب امجد کی باری تھی اس نے بے پروائی سے اپنا گلدستہ پھینکتے ہوئے کہا ”میں بھی لال رنگ کے پھول لوں گا!“

سلیم نے دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا ”اچھا گاؤں پہنچ کر میں تم سب کو پھول لا

دوں گا‘‘

گاؤں پہنچ کر راحت اور عصمت، زبیدہ اور سلیم کی چچا زاد بہنوں کے ساتھ کھیلتی رہیں اور ارشد، سلیم، مجید، گلاب سنگھ اور دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیتوں میں گھومتا رہا۔گھر کی تمام عورتوں کی خواہش تھی کہ ارشد کی ماں کم از کم ایک رات ضرور ان کے ہاں ٹھہرے لیکن جب ارشد کی ماں نے کہا کہ وہ کل دس بجے کی گاڑی سے جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو انہوں نے اصرار نہ کیا۔

ارشد کی ماں نے سلیم کی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ امرتسر سے خط لکھا کرے گی اور کبھی کبھی ملنے بھی آیا کرے گی عصمت نے سلیم کی چھوٹی بہن زبیدہ اور اس کی چچا زاد بہنوں صغریٰ اور امینہ سے خط و کتابت جاری رکھنے کا وعدہ کیا جب واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے تو ارشد نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا اور وہ سلیم کی والدہ سے مخاطب ہو کر بولی:

’’بہن !سلیم کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دو، رات یہ ہمارے پاس رہے گا،صبح ہم گاڑی پر سوار ہو جائیں گے اور یہ سکول چلا جائے گا۔‘‘

ماں نے خوشی سے سلیم کو اجازت دے دی

رات کے وقت ارشد، عصمت، راحت اور امجد اپنے مکان کے ایک کشادہ کمرے میں سلیم کے گرد بیٹھ کر کہانی سن رہے تھے دوسرے کمرے میں ڈاکٹر شوکت آرام کرسی پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے ارشد کی ماں ان کے قریب بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔

''سلیم بہت ہونہار لڑکا ہے!'' ڈاکٹر نے اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''آج میں ارشد کا سرٹیفکیٹ لینے گیا تھا تو ہیڈ ماسٹر بھی اس کی تعریف کرتا تھا!''

وہ مسکرا کر بولی ''میں نے آج اس کی ماں سے کہا تھا کہ جب بہو تلاش کرنے کے لیے نکلو تو سب سے پہلے میرے گھر آنا اور وہ پھولی نہیں سماتی تھی وہ عصمت کو گود میں لے کر پیار کرنے کے بعد مجھ سے کہنے لگی ''بہن! مجھے تو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے اپنی بہو ڈھونڈ لی ہے کہو تو ابھی مٹھائی بانٹ دوں''

''بس وہی عورتوں والی بات، بچہ ابھی گود میں ہوتا ہے اور شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں!''

وہ بولی ''ذرا دیکھو تو اٹھ کر، یہ جوڑا کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے میں تو کہتی ہوں دو تین برس کے بعد بات پکی ہو جائے آج کل اول تو اچھے خاندان نہیں ملتے اور اگر خاندان مل جائے تو لڑکے آوارہ ہوتے ہیں!''

ڈاکٹر صاحب نے قدرے نرم ہو کر کہا ''بھئی خاندان تو بہت اچھا ہے، اب لڑکے کو اچھی تعلیم دلوائیں تو دیکھا جائے گا!''

''وہ کوئی نادار تھوڑے ہیں اس کی ماں کہتی ہے کہ ہم اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم کے لیے ولایت بھیجیں گے!''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا ''بھئی اگر وہ ولایت سے ہو آیا تو پھر تم کوئی توقع نہ رکھنا پھر وہ نہ ان کا نہ ہمارا''

''خدا کے لیے کوئی نیک دعا کرو!'' وہ سنجیدہ ہو کر بولی

اگلے دن سلیم اسٹیشن پر انہیں الوداع کہہ رہا تھا گاڑی دھوئیں کے بادل اڑاتی ہوئی آئی اور وہ سب سوار ہو گئے ارشد اپنے باپ کے ساتھ مردانہ ڈبے میں بیٹھا۔ عصمت، راحت اور امجد اپنی ماں کے ساتھ زنانہ ڈبے میں سوار ہو گئے ان کا نوکر علی الصباح ٹرک پر سامان لاد کر روانہ ہو چکا تھا۔

گاڑی نے سیٹی بجائی ارشد کے باپ نے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے خدا حافظ کہا سلیم نے مصافحہ کیا پھر جلدی سے ارشد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ارشد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ زنانہ ڈبے کی کھڑکی سے عصمت اور راحت اس کی طرف جھانک رہی تھیں گاڑی نے دوسری سیٹی بجائی اور انجن ”پھپ، پھپ“ کرتا چل پڑا۔ عصمت اپنی اوڑھنی سے آنسو پونچھ رہی تھی گاڑی نکل گئی اور ساتھ ہی سلیم کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

”ارے تم رو رہے ہو؟“ کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مجید کی آواز پہچان کر اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور کوئی بات کیے بغیر اسکول کی طرف چل دیا۔

دوسرا حصہ

دھڑکنیں

وقت گزرتا گیا شاہراہ حیات پر زندگی کے سادہ، رنگین اور دلفریب نقوش ماضی کے دھندلکوں میں روپوش ہوتے گئے۔ سلیم اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد لاہور کے ایک کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ مجید میٹرک کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد فوج میں بھرتی ہو چکا تھا۔ سلیم کے گاؤں کے دو اور ساتھی گلاب سنگھ اور رام لال میٹرک سے پہلے ہی سکول چھوڑ چکے تھے رام لال کو شہر کے کارخانے میں منشی کی جگہ مل گئی تھی اور گلاب سنگھ کاشتکاری میں اپنے باپ اور چچوں کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

پڑوس کے گاؤں میں بلونت سنگھ اور رکندن لال امرتسر کے کسی کالج میں داخل ہو گئے تھے۔ پرائمری سکول والے گاؤں کے ماسٹر کا لڑکا احمد ضلع کے کسی دفتر کا کلرک اور پٹواری کا لڑکا معراج الدین ریلوے میں بابو بن چکا تھا۔

ڈاکٹر شوکت کی تبدیلی کے بعد کچھ عرصہ ارشد کے ساتھ سلیم کی خط و کتابت رہی اس کے بعد سلیم کو چند خطوط کا جواب نہ آیا اور خط و کتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا، زبیدہ، امینہ اور صغریٰ کے نام عصمت کے خطوط آتے رہے لیکن ان کی طرف سے باقاعدہ جواب نہ جانے پر وہ بھی خاموش ہو گئی۔

کالج میں سلیم کی دلچسپیوں کے ہزاروں اسباب تھے وہ ان نوجوانوں میں سے

تھا جنہیں ہر ماحول میں دوست اور قدردان مل جاتے ہیں۔ ہوسٹل میں اس کی شگفتگی اور زندہ دلی مشہور تھی۔ طلباء کی کسی محفل میں کالج کے ذہین اور ہونہار لڑکوں کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتیں تو سلیم کا ذکر بھی ضرور آتا۔ میٹرک کا امتحان دینے کے بعد اس نے چند نظمیں اور کہانیاں لکھیں تھیں جنہیں وہ چھپا کر رکھا کرتا تھا لیکن وہ خصائل جو قدرت کے عطا کردہ ہوں، دیر تک پوشیدہ نہیں رہتے سلیم نے جھجکتے جھجکتے اپنی ایک نظم کالج کے میگزین میں بھیج دی۔ ایڈیٹر نے نہ صرف اسے شائع کیا بلکہ اس کی تعریف میں ایک مختصر سا نوٹ بھی لکھا۔ یہ اس کی شہرت کا آغاز تھا اس کے بعد اس نے دیہاتی زندگی کے متعلق ایک افسانہ لکھا جسے نظم سے کہیں زیادہ پسند کیا گیا۔

اسی افسانے کی بدولت وہ اختر کے ساتھ متعارف ہوا۔ اختر اس سے ایک جماعت آگے تھا اور اس کا شمار کالج کے ذہین ترین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ وہ کالج کے میگزین کے علاوہ دوسرے ادبی رسائل اور اخبارات کے لیے سیاسی مضامین لکھا کرتا تھا۔ وہ چھریرے بدن کا ایک مختصر انسان تھا لیکن اس کی کشادہ پیشانی، بڑی بڑی آنکھوں اور بھنچے ہوئے ہونٹوں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے۔ ہوسٹل میں وہ بہت کم لڑکوں کے ساتھ میل جول رکھتا تھا۔ کھانے کی میز پر لڑکے ایک دوسرے کی معمولی شرارتوں پر قہقہے لگاتے لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آتا۔ لڑکے کسی مسئلے پر بحث چھیڑ دیتے اور ہر ایک دوسرے کی سننے کی بجائے اپنی سنانے کے لیے زیادہ بے قراری ظاہر کرتا۔ اختر کو اگر موضوع سے دلچسپی نہ ہوتی تو چپکے سے کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں چلا جاتا

لیکن جب کبھی وہ بولتا، سننے والے یہ محسوس کرتے کہ وہ بحث میں حصہ لینے کی بجائے اپنا فیصلہ سنا رہا ہے کبھی کبھی کالج میں علمی، ادبی اور سیاسی موضوعات پر تقریریں ہوتیں تو اختر ان میں بھی حصہ لیتا اور موضوع کی موافقت اور مخالفت میں اس کی تقدیر فیصلہ کن سمجھی جاتی۔

سلیم کے ساتھ اختر کی پہلی ملاقات بہت مختصر تھی ایک دن وہ تیزی سے ہوسٹل کی سیڑھیوں سے اتر رہا تھا اور اختر اوپر آ رہا تھا۔موڑ پر دونوں کی ٹکر ہوگئی۔اختر کے ہاتھ سے کتابیں گر پڑیں۔

''اوہو معاف کیجئے!''سلیم نے پریشان سا ہو کر کہا

''کوئی بات نہیں''اس نے مسکرا کر جواب دیا

سلیم نے جلدی سے کتابیں اٹھا کر اسے پیش کیں اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا

اختر نے کہا''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''میں لیٹر بکس میں خط ڈالنے جا رہا ہوں''

''بھئی اگر تکلیف نہ ہو تو ایک خط میرا بھی لے جاؤ میں نے کل سے لکھ رکھا ہے باہر نکلتا ہوں تو یاد نہیں رہتا۔''

''بہت اچھا لائیے!''سلیم اختر کے پیچھے اس کے کمرے میں داخل ہوا اختر نے میز سے خط اٹھاتے ہوئے کہا۔۔۔۔غالباً کالج میگزین میں''آخری مسکراہٹ''کے عنوان سے آپ ہی کا افسانہ شائع ہوا ہے!

''جی میں نے یونہی لکھ دیا تھا''

''مجھے آپ کی طرزِ تحریر بہت پسند آئی ہے افسانے کا پلاٹ بھی بہت دل کش تھا لیکن مجھے سب سے زیادہ اس کے وہ حصے پسند ہیں جن میں آپ نے گاؤں کے مناظر پیش کیے ہیں شاید اس لیے کہ میں گاؤں کی زندگی سے قطعاً نا آشنا ہوں دیہاتی زندگی کے متعلق آپ نے اور بھی کچھ لکھا ہے؟''

سلیم نے کہا ''گرمیوں کی چھٹیوں میں میں نے ایک مضمون لکھا تھا اس کا عنوان ہے ''میرا گاؤں'' وہ کافی طویل ہے آپ کو کبھی فرصت ہو تو میں دکھاؤں گا!''

''بھئی میں ضرور پڑھوں گا اگر آپ کے پاس ہے تو ابھی دے دیجئے۔ مجھے اس وقت کوئی کام نہیں!''

سلیم نے قدرے پریشان ہو کر کہا ''مجھے ڈر ہے کہ اس میں بعض واقعات ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر آپ ہنسیں گے''

اختر نے مسکرا کر جواب دیا ''پھر تو میں ضرور پڑھوں گا لائیے!''

سلیم نے اپنے کمرے میں سے ایک کاپی لا کر اختر کے ہاتھ میں دے دی اور خط ڈالنے کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

شام کے وقت اختر پہلی بار سلیم کے کمرے میں آیا اس کے ہاتھ میں وہ کاپی تھی جو دوپہر کے وقت سلیم نے اسے دی تھی ''لیجئے سلیم صاحب!'' اس نے کہا ''میں نے پڑھ لیا آپ کا مضمون!''

''تشریف رکھیے!'' سلیم نے کہا

اختر کرسی پر بیٹھ گیا اور سلیم اپنے دل میں مسرت اور اضطراب کی ملی جلی دھڑکنیں محسوس کرنے لگا۔ اختر کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ پھیلتی گئی اور سلیم کے خدشات دور ہوتے گئے۔

وہ بولا ''سلیم صاحب! آپ کا مضمون بے حد دلچسپ تھا میں تو یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں گاؤں میں گھوم رہا ہوں اور وہ رمضان اگر آپ کے گاؤں کا کوئی جیتا جاگتا آدمی ہے تو میں اسے کبھی نہ کبھی ضرور دیکھوں گا آپ اس مضمون کو اشاعت کے لیے ضرور بھیجئے!''

یہ ایک خوش گوار ابتدا تھی، اس کے بعد سلیم اور اختر ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ سلیم کو اختر کی شخصیت میں ایک دوست، ایک نگران اور ایک رہنما مل چکا تھا۔ وہ اس کے لیے کالج کی لائبریری سے کتابیں منتخب کرتا۔ اس کے ادبی کارناموں کے عیوب و محاسن کے متعلق بے لاگ رائے دیتا۔ علی الصباح اسے اپنے ساتھ پڑوس کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے اور قرآن کا درس سننے کے لیے لے جاتا۔ شام کو وہ کبھی کبھی سیر کو نکل جاتے۔

اختر ماضی اور حال کا موازنہ کرنے کے بعد قوم کے مستقبل کے متعلق بے چین رہا کرتا تھا۔ اس کے خدشات کبھی کبھی سلیم کو بھی پریشان کر دیتے لیکن وہ احساس کی اس شدت سے آشنا نہ تھا جو اختر کو مضطرب رکھا کرتی تھی۔ سلیم نے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس میں نکھری ہوئی بہاریں تھیں، اس میں قوس کے رنگ تھے، اس میں دھوپ اور چھاؤں کا امتزاج تھا۔ وہ اگر ایک لمحہ کے لیے سنجیدہ ہوتا تو فوراً ہی

قہقہہ لگانے کے لیے بے قرار ہو جاتا۔ وہ ابھی تک ان دھڑکنوں سے نا آشنا تھا جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہیں۔

انتہائی انس اور محبت کے باوجود سلیم کے لیے کبھی کبھی اختر کی صحبت بوجھل سی ہو جاتی۔ بالخصوص اس وقت جب قوم کے سیاستدانوں اور لیڈروں پر نکتہ چینی کرنے کے بعد آنے والے دور کی بھیانک تصویریں پیش کرتا۔ سلیم یہ محسوس کرتا کہ اختر خفا ہے۔ ساری دنیا سے خفا ہے اور پھر اپنے گاؤں کا کوئی واقعہ یا کوئی لطیفہ سنا کر گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتا لیکن اختر کے طرز عمل سے ظاہر ہوتا کہ آج اس کے کان ایسی باتوں کے لیے بند ہیں اس کی خشمگیں نگاہیں سلیم کو خاموش کر دیتیں۔ وہ کہتا ''سلیم! ہم ایک آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑے ہیں ہم پر ایک بہت ہی نازک وقت آنے والا ہے۔ اجتماعی آلام و مصائب کا سامنا کرنے کے لیے جس اجتماعی شعور اور کردار کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہم میں مفقود ہے، اگر ہم نے آنکھیں نہ کھولیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہندوستان میں ہمارا وہی حشر نہ ہو جو اسپین میں ہو چکا ہے۔''

اس قسم کی تقریریں سلیم کو پریشان کر دیتیں اور رات کے وقت جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا تو اس کے کانوں میں اختر کے الفاظ گونجتے۔ کچھ دیر وہ بے چینی میں کروٹیں لیتا۔ پھر اس کے منتشر خیالات اپنے گاؤں پر مرکوز ہو جاتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی بھیانک صحرا سے نکل کر نخلستان میں پہنچ گیا ہے۔ وہ نخلستان جہاں زندگی کی دائمی مسکراہٹیں اور قہقہے ماضی، حال اور مستقبل کی قیود سے آزاد ہیں وہ سو جاتا، اسے

چڑیوں کے چہچہے سنائی دیتے، پچھلے پہر کھیت میں ہل چلانے والے کسان کے الغوزے کی آواز سنتا۔ جھیل کے شفاف پانی سے کنول کے پھول توڑتا۔ آم کے درخت کے ساتھ جھولا جھولتا اور گندم کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر گھوڑا دوڑاتا، کبھی کبھی وہ سپنوں کی وادی کے ان گوشوں تک پہنچ جاتا جہاں زندگی کے ابتدائی نقوش وقت کی ریت میں دب چکے تھے اور جب وہ میٹھے اور سہانے سپنوں کے بعد بیدار ہوتا تو اختر کی باتیں اسے وہم معلوم ہوتیں۔



لیکن حال کے آئینے پر مستقبل کے چہرے کے جو خدوخال ظاہر ہو رہے تھے وہ تدریجاً بھیانک ہوتے گئے۔ زندگی کے افق پر گردوغبار جسے سلیم محض وہم سمجھتا تھا نمایاں ہوتا گیا، اس نے بچپن میں اس قسم کی کہانیاں سنی تھیں کہ ایک مسافر کسی شہر میں داخل ہوا۔ بازاروں اور گلیوں میں خوب چہل پہل تھی۔ کہیں برات کی دھوم دھام تھی اور کہیں مداریوں اور بازیگروں کے تماشے تھے وہ ان دلچسپیوں میں کھو گیا۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے لیکن اچانک افق پر گردو غبار کے بادل اٹھے اور آن کی آن میں ایک تاریک آندھی چاروں طرف چھا گئی۔۔۔۔ لوگ سراسیمہ ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مسافر بدحواس ہو کر ان سے پوچھ رہا تھا "تم کیوں بھاگ رہے۔۔۔؟" لیکن کسی نے اسے جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی لوگ اس قدر خوفزدہ تھے کہ کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی بچے،

عورتیں، جوان اور بوڑھے سب چیختے چلاتے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اس سراسیمگی کی حالت میں کئی بچے، بوڑھے اور اپاہج دوسروں کے پاؤں تلے کچلے گئے۔

مسافر خوفزدہ ہو کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اچانک آندھی رک گئی اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں لیکن مسافر حیران تھا کہ طوفان گزر جانے کے باوجود لوگوں کی سراسیمگی میں کمی نہیں ہوئی وہ پہلے سے زیادہ بدحواس ہو کر ایک دوسرے کے اوپر گر رہے تھے۔ اچانک ایک مہیب دیو نمودار ہوا۔ اس کا رنگ سیاہ اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں اس کے بڑے بڑے دانتوں سے رال ٹپک رہی تھی اور سر پر بالوں کی جگہ ہزاروں سانپ لہرا رہے تھے اور زمین اس کے پاؤں تلے لرز رہی تھی اس کے قہقہے بجلیوں کی کڑک سے زیادہ ہولناک تھے وہ بچوں، عورتوں اور آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر ہوا میں اچھالتا اور جب وہ گرتے تو انہیں اپنے پاؤں سے کچل دیتا۔ نوجوان لڑکیاں چیخیں مار مار کر کنوؤں، نہروں اور تالابوں میں کود رہی تھیں۔ بعض لوگوں نے اپنے مکانوں کے دروازے بند کر رکھے تھے لیکن اس کے مضبوط ہاتھوں کے سامنے یہ دروازے کوئی حقیقت نہ رکھتے تھے وہ انہیں ہاتھ پاؤں کی ایک ہی ضرب سے توڑ ڈالتا اور پھر قہقہہ لگا کر کہتا "اب تم کہاں جا سکتے ہو، آج میں آزاد ہوں سالہا سال قید میں رہنے کے بعد آج پہلی مرتبہ مجھے آزادی ملی ہے۔ قید میں میرے ہاتھ پاؤں مضبوط زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے اور میں بے بسی کی حالت میں دانت پیستا رہا۔ میرے کان خوبصورت لڑکیوں کی چیخیں سننے کے لیے

بے قرار تھے۔ میرے ہاتھ تمہیں ہوا میں اچھالنے اور میرے پاؤں تمہیں مسلنے کے لیے بے چین تھے۔۔۔۔ تم چیخ رہے ہو۔۔۔۔۔ لیکن قید خانے کی تنہائیوں میں میری چیخوں کا تصور کرو۔ میں تمہاری ہڈیوں کے تصور میں قید خانے کی آہنی سلاخوں کو مروڑا کرتا تھا اور میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ جایا کرتے تھے۔ اس وقت میں یہ عہد کیا کرتا تھا کہ آزادی ملتے ہی جی بھر کر اپنے ارمان نکالوں گا۔ میں آج آزادی کا ناچ ناچوں گا۔ میرے لیے اپنی لاشوں کی سیج بچھا دو!''

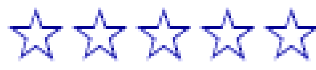
بھارت ماتا ہندو سامراج کے اس عفریت کو جنم دے چکی تھی۔ جس کے ذہن میں آزادی کا مفہوم دس کروڑ مسلمانوں کو حقوق آزادی سے محروم کرنا تھا۔ وہ سانپ اپنے بل سے سر نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔ جس کے زہر نے صدیوں پیشتر اچھوت کی رگوں سے زندگی کی حرارت چھین لی تھی صدیوں پیشتر ہندو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھوتوں کا بلی دان دیا کرتا تھا اور دیوتاؤں نے اسے اچھوتوں کی بستیاں جلانے اور ان کی جھونپڑوں کی راکھ پر اپنے عشرت کدے تعمیر کرنے کی آزادی دے رکھی تھی۔ صدیوں تک بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کے مظالم برداشت کرنے کے بعد اچھوت کی قوت مدافعت ختم ہو چکی تھی۔ وہ برہمن اور اونچی ذات کے ہندوؤں کی تقدیس کے احترام میں اپنے تمام انسانی حقوق سے دست بردار ہو چکا تھا۔

لیکن اب ہندو کے سامنے دس کروڑ مسلمانوں کا مسئلہ تھا اور یہ وہ قوم تھی جس نے اس ملک پر صدیوں تک حکومت کی تھی ہندو نے اچھوت کو ورن آشرم کی آخری

کڑی بنانے سے پہلے اپنی تلوار سے مغلوب کیا تھا لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں محمد بن قاسمؒ کے زمانے سے لے کر احمد شاہ ابدالی کے زمانے تک یہ تلوار بے اثر ثابت ہوئی پانی پت کی رزمگاہیں ہندو کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھیں کہ تلوار کی جنگ میں وہ اس قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ پرانے دیوتاؤں سے مایوس ہو کر ایک نئے دیوتا کی اعانت کا طلب گار رہا یہ نیا دیوتا انگریز تھا۔

انگریز نے اس وقت ہندوستان میں قدم رکھے جب مسلمانوں کی سطوت کے ستون کھوکھلے ہو چکے تھے تاہم ان کی آخری قوت مدافعت جو بنگال میں سراج الدولہ اور جنوبی ہند میں سلطان ٹیپوؒ کی شخصیتوں میں ظاہر ہوئی، انگریز کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ اس قوم کی خاکستر میں ابھی تک چنگاریاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو کچلنے کے لیے ہندو کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مسلمان انگریز کی نظر میں اور زیادہ معتوب ہو گیا اور وہ چکی کے دو پاٹوں، انگریز اور ہندو کے درمیان پسنے لگا۔

انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان کے اندر مغربی طرز کی جمہوریت کے تصور سے ہندو کی وہ پرانی جبلت زندہ ہو رہی تھی جس نے برہمن کی تقدیس کا چولا پہن کر نیچ ذات کو ہمیشہ کے لیے حقوق انسانیت سے محروم کر دیا تھا۔ ہندو جانتا تھا کہ ایک مرکز کے تحت جمہوری نظام حکومت میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں کو بھی سیاسی اور اقتصادی اچھوت کا درجہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے گا۔ چنانچہ ہندو ورن آشرم کی جگہ ہندی نیشنل ازم نے لے لی۔



ہندی نیشنل ازم آل انڈیا کانگریس کا لبادہ پہن کر میدان میں آیا۔اس نئی تحریک کے اغراض و مقاصد منو جی کے وان آشرم سے مختلف نہ تھے۔صرف اتنا فرق تھا کہ منو جی کی تحریک نے برہمن کی تقدیس کا سہارا لیا تھا اور کانگریس کی تحریک ہندو اکثریت کے بل بوتے پر رام راج قائم کرنا چاہتی تھی۔منو جی کے ہاتھ میں تیز چھری تھی اور اس نے بلا تامل اچھوتوں کو ذبح کر کے برہمن کے قدموں میں ڈال دیا لیکن گاندھی کی آستین میں ایک زہر آلود نشتر تھا جسے استعمال کرنے سے پہلے وہ مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ لینا ضروری سمجھتا تھا۔منو جی نے اچھوت کو دھتکارا تھا لیکن گاندھی کو خطرہ تھا کہ یہ قوم جسے نابود کرنے کا کام سماج کے مقدس دیوتاؤں نے اسے سونپا ہے، سو رہی ہے، مردہ نہیں ہوئی۔اس لیے وہ اپنا زہر آلود نشتر آزمانے سے پہلے انہیں بیہوشی کے ٹیکے لگانا ضروری سمجھتا تھا گاندھی کا طریق کار وہی ہوتا جو منو کا تھا، تو مورخ شاید پانی پت کی ایک اور جنگ دیکھتے اور دہلی کے لال قلعے پر جو جھنڈا انگریز کے جانے کے بعد لہرایا جاتا اس پر اشوکا کے چکر کی بجائے محمد بن قاسم کی تلوار کا نشان ہوتا، گاندھی نے ہندو اکثریت کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اچھوتوں کے لیے بھارت ماتا کی گود کشادہ کر دی۔ان کے لیے چند مندروں کے دروازے کھل گئے۔ انہیں سماج کے مقدس بیٹوں کے چند کنوئیں بھرشٹ کرنے کی اجازت بھی مل گئی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی اور وہ صدیوں کے بعد ایک کروٹ لے کر پھر بھارت ماتا کے قدموں میں سو گئے ۔۔۔۔۔۔مسلمانوں کا مدافعانہ احساس

کچلنے کے لیے گاندھی نے انہیں آزادی کا سراب دکھایا۔ تحفظات کا مطالبہ کرنے والوں کو تنگ نظر، فرقہ پرست، انگریز کے ایجنٹ اور وطن کی آزادی کے دشمن کہا گیا۔ مسلمانوں میں ایسے لوگ اس وقت بھی موجود تھے جو اس سراب کی حقیقت سے واقف تھے۔ جو گاندھی کی آستین میں چھپے ہوئے خنجر کو اپنی شاہ رگ کے قریب آتا دیکھ رہے تھے، جو ہندو مقاصد کی چٹان کو بتدریج پانی سے ابھرتا ہوا دیکھ کر قوم سے کہہ رہے تھے کہ وہ تمہاری ناؤ رام راج کی اس خطرناک چٹان کی طرف دھکیل رہا ہے جس کے ساتھ ٹکرا کر یہ پاش پاش ہو جائے گی اور تم اچھوتوں کی طرح موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

لیکن ایسی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہوئیں، گول میز کانفرنس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ کانگریس جس انقلاب کا نعرہ لگا رہی ہے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت کے بعد مسلمان اپنا سیاسی مستقبل ہندو اکثریت کو سونپ دیں۔

کانگریس نے کئی بار حکومت کے ساتھ سودا کرنے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ انگریز اقلیتوں کو نظر انداز کر کے اس کی واحد نمائندگی کو تسلیم کر لے لیکن انگریز دس کروڑ مسلمانوں کے وجود سے قطعی انکار نہ کر سکا۔ بھارت ماتا کے لاڈلے بیٹوں کی تسکین کے لیے دس کروڑ مسلمانوں پر اپنی سنگینوں کا پہرا بٹھانے میں اسے کوئی مصلحت نظر نہ آئی۔ انگریز کے متعلق کانگرس کی پالیسی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ گاندھی جی کی آتما نے کئی چولے بدلے۔ لیکن مسلمانوں کے متعلق ان کے

طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔تاہم آزادی کے نعروں میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ مسلم عوام کا جوش وخروش ابھی تک کانگرس کے ساتھ تھا۔

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کی آنکھ اس وقت کھلی جب حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ کانگریس جسے آزادی کہتی تھی، وہ ہندو اکثریت کی حکومت کا دوسرا نام تھا1937ء کے انتخابات نے پہلی بار کانگرس کی حکومت ہندوستان کے سات صوبوں پر مسلط کر دی۔ہندو سیاستدانوں نے مسلمانوں کو نرغے میں لینے کے لیے جس قدر اطمینان اور دور اندیشی کا مظاہرہ کیا تھا۔اسی قدر وہ نرغے میں پھنسے ہوئے شکار کو مغلوب کرنے کے لیے جلد بازی پر اتر آئے۔۔۔۔وار دھائی مہاتما کا زہر میں بجھا ہوا نشتر اب آستین سے باہر آچکا تھا۔۔۔۔رام راج کی برکات واردھا یا ودیا مندر جیسی ناپاک اسکیموں کی صورت میں نازل ہونے لگیں رب کعبہ کے سامنے سر بجود ہونے والی قوم کے بچوں کو مدارس میں گاندھی کی مورتی کے سامنے ہاتھ باندھنے کا سبق دیا جاتا۔محمد عربی کی نعت پڑھنے والوں کو بندے ماترم کا ترانہ سکھایا جا رہا تھا۔ دختران توحید کے نصاب تعلیم میں دیوداسیوں کے رقص شامل کیے جا رہے تھے۔ ۔۔۔مسلمانوں کے حلق میں یہ زہر انڈیلنے کے لیے ان تجاویز کے بانیوں نے وہ ہاتھ منتخب کیے جن کی انگلیوں پر ابھی تک قرآن حکیم کی تفسیریں لکھنے والے قلم کی سیاہی کے نشان موجود تھے۔

رام راج کی بقا کے لیے مسلمانوں کے تمدن کے علاوہ ان کی زبان بدلنے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی۔ چنانچہ اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جدوجہد زیادہ شدومد کے ساتھ شروع ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے گاندھی جس موقع کا منتظر تھا، وہ ابھی تک نہیں آیا تھا لیکن ہندو عوام جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف محاذ بنانے کے لیے یہاں تک گوارا کرلیا تھا کہ اچھوت انکے چند مندروں کو بھرشٹ کر ڈالیں، کینہ اور نفرت کے ان جذبات کو دیر تک چھپا کر نہ رکھ سکے، جن کی اساس پر ہندو نیشنلزم کی عمارت کھڑی کی گئی تھی۔ چنانچہ وسط ہند کے صوبوں میں لوٹ مار اور قتل کی وارداتیں شروع ہوئیں، جس شہر یا گاؤں میں ہندو مسلمانوں پر حملہ کرتے، وہاں کانگرسی حکومت کی پولیس ثالث بن کر پہنچتی اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مصالحت کرنے کے لیے ذلیل ترین شرائط ماننے پر مجبور کیا جاتا۔

مسلم لیگ کی طرف سے مصالحت اور تعاون کی پیش کش ٹھکرائی جا چکی تھی جواہر لال نہرو کے یہ الفاظ فضا میں گونج رہے تھے ''ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک انگریز، دوسری کانگرس''

رام راج کا یہ دور اگرچہ مختصر تھا تاہم سنجیدہ مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ اگر انہوں نے آنکھیں نہ کھولیں تو اندلس کی تاریخ ہندوستان میں بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ چنانچہ مارچ 1940ء کو مسلمانوں کے مدافعانہ شعور کی عملی صورت پاکستان کی قرارداد کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

پاکستان کا مطالبہ سراسر مدافعانہ تھا۔ مسلمان ہندو فسطائیت کے اٹھتے ہوئے سیلاب کے سامنے ایک دفاعی خط کھینچنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو ان کی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خودمختاری کا حق دے کر اپنی اکثریت کے صوبوں میں آزادی اور خودمختاری کا حق مانگا تھا۔ انہوں نے ہندوستان کے تین چوتھائی حصے پر ہندو اکثریت کا حق تسلیم کرلیا اور اپنے لیے جو علاقہ مانگا تھا وہ ان کی مجموعی آبادی کے تناسب سے بھی کم تھا لیکن ہندو ایک مرکز کے ماتحت درہ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک اپنی اکثریت کے دائمی تسلط کے خواب دیکھ چکا تھا۔ واردھا کے صنم خانوں میں وہ اسکیمیں تیار ہو چکی تھیں جن کی بدولت چند سال میں مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور روحانی اعتبار سے یتیم بنایا جاسکتا تھا۔

مسلمانوں کو مطالبہ پاکستان پر متحد ہوتا دیکھ کر بھارت کے بیٹوں نے یہ محسوس کیا کہ شکار ہاتھ سے جا رہا ہے۔ مرغ حرم نے متحدہ قومیت کے اس دام فریب کو پہچان لیا ہے، جسے بظاہر بے ضرر بنانے کے لیے عدم تشدد کی بھٹی سے رنگ دیا گیا تھا۔ چنانچہ وہ تلملا کر رہ گئے۔ جال بچھانے والے شکاری جو یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ منتشر پرندے بے تحاشا ان کی شکار گاہ کا رخ کر رہے ہیں۔ انہیں کسی اور طرف مائل پرواز دیکھ کر اپنی کمین گاہوں سے باہر نکل آئے۔ اضطراری حالت میں انہوں نے اپنے چہروں سے وہ نقاب اتار کر پھینک دیے جو مسلمانوں کو دھوکا دے رہے تھے مسلمان یہ دیکھ رہا تھا کہ آزاد خیال ہندو، تنگ نظر ہندو، دیوتاؤں کی پوجا کرنے والے ہندو، دیوتاؤں سے بیزاری ظاہر کرنے والے ہندو، اچھوت کو گلے

لگانے والے ہندو اور اچھوت کو سب سے زیادہ قابل نفرت مخلوق سمجھنے والے ہندو، انگریز کی خوشامد اور چاپلوسی سے اقتصادی مراعات حاصل کرنے والے ہندو اور فقط بکری کے دودھ اور پھلوں کے رس پر قناعت کر کے انگریز کو مرن برت کی دھمکیاں دینے والے ہندو سب ایک تھے۔ کفر اپنے ترکش کے ہر تیر کو جمع کر چکا تھا لیکن مسلمان ابھی تک بکھرے ہوئے تیروں اور ٹوٹی ہوئی کمانوں کو گن رہے تھے۔

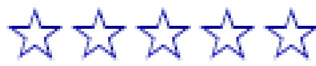
اگر مسلمان پاکستان کا مطالبہ دس 1 سال پہلے کرتے تو عدم تشدد کے دیوتا اور اس کے پجاری اس وقت بھی اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو جاتے اور مسلمانوں کو اپنی مدافعانہ تیاریوں کا موقع مل جاتا لیکن انہیں اس وقت اپنے ٹوٹے ہوئے مکان کی چھت اور دیواروں کی مرمت کی فکر ہوئی جب افق پر چاروں طرف تاریک گھٹائیں اٹھ رہی تھیں۔ ہندو جس یقین محکم کے ساتھ اپنے جارحانہ ارادوں کی تکمیل کے لیے آگے بڑھ رہا تھا، وہ مسلمانوں میں مفقود تھا۔ نیم خوابی کی حالت میں واردھائی مکر و فریب کے پھندے دیکھنے کے بعد مسلمان اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے پاکستان کی منزل مقصود کا رخ کر رہے تھے۔

---

1 ترجمان حقیقت علامہ اقبالؒ دس سال قبل پاکستان کو مسلمانوں کی منزل مقصود قرار دے چکے تھے لیکن اس وقت اسے شاعر کا ایک خواب سمجھا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی غالباً تحریک پاکستان کے اولین محرکوں میں سے ایک ہیں۔ جو پاکستان کو اپنا مقصد حیات بنا چکے تھے لیکن وہ فقط ایک محدود طبقے کو متاثر کر سکے۔ اس کی وجہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور سیاسی شعور کے فقدان کے علاوہ یہ بھی تھی کہ ہندو

فسطائیت ابھی تک مکروفریب کے کئی چولوں میں چھپی ہوئی تھی۔

ہندو نے جہاں گزشتہ پندرہ بیس برس میں اپنی قوم کو متحد اور منظم کر لیا تھا، وہاں مسلمانوں کے اندر انتشار کے کئی بیج بو دیے تھے۔ وہ اس بات کے لیے تیار تھا کہ اگر متحدہ قومیت، عدم تشدد اور وطنیت کی لوریاں مسلمانوں کو موت کی نیند نہ سلا سکیں اور وہ اپنی شاہ رگ کے قریب اس کا زہر آلود خنجر دیکھ کر چونک پڑیں تو ان کے حلق میں خواب آور گولیاں ٹھونسنے کے لیے ان بزرگان دین کے ہاتھ استعمال کیے جائیں جن کا جبہ اور دستار یہ ظاہر کرتا ہو کہ جنت کی راہ دکھانے والے یہی ہیں۔ چنانچہ کانگرس ان ملت فروشوں کی ایک جماعت تیار کر چکی تھی، جو ایک ہاتھ سے مسلمانوں کو قرآن دکھاتے تھے اور دوسرے ہاتھ سے ان کے گلے میں ہندو کی غلامی کا طوق پہنانا چاہتے تھے۔



تجربہ کار شکاری جب یہ دیکھتے ہیں کہ پرندے ان کے جال کو پہچاننے لگے ہیں تو وہ سدھائے ہوئے ہم جنس پرندوں کو پنجروں میں بند کر کے جال کے آس پاس جھاڑیوں میں چھپا دیتے ہیں۔ ان سدھائے ہوئے پرندوں کی بولی سے آس پاس بھٹکنے والے پرندے دھوکا کھا کر جال میں آ پھنستے ہیں اس طریقہ سے عام طور پر تیتر اور بٹیر کا شکار کیا جاتا ہے۔ اپنے ہم جنسوں کو بلا خطر جال کی طرف آنے کی ترغیب دینے والے تیتروں یا بٹیروں کو شکاریوں کی اصطلاح میں بلا وے 1 کے تیتر یا بٹیر کہا

جاتا ہے۔

1۔ پنجابی میں ''بلارا'' بھی کہتے ہیں

تلیروں کے شکار میں یہ طریق کار بدلنا پڑتا ہے سیر تلیر شکاریوں کی ہزار ناز برادری کے باوجود بھی اپنے ساتھیوں کو جال کی طرف رخ کرنے کا بلاوا نہیں دیتا۔ اس لیے اسے دھوکا دینے کے لیے مولے کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مموا گھریلو چڑیا سے قدرے بڑا ہوتا ہے اور تلیر اسے اپنا پیدائشی دشمن خیال کرتا ہے، شکاری مولے کو پکڑ کر پھندے کے قریب باندھ دیتے ہیں اور تلیروں کا غول اسے دیکھتے ہی پھندے یا جال سے بے پرواہ ہو کر اس پر حملہ کر دیتا ہے۔

واردھا کے کہنہ مشق شکاری نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان ہندو سامراج کے دام فریب سے خطرہ محسوس کر کے پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں تو اس نے نام نہاد علمائے دین کے اس گمراہ ٹولے کو آگے کیا جو خدا پرستی سے توبہ کر کے وطن کا پجاری بن چکا تھا، جو محمد عربیؐ کے دامن کا سہارا چھوڑ کر لنگوٹی والے مہاتما سے رشتہ جوڑ چکا تھا۔ ان لوگوں کو وہی کام سونپا گیا جو شکاری بلاوے کے تیتروں اور بٹیروں سے لیتے ہیں یہ علماء ہندو سامراج کا جال بچھانے والے شکاریوں کی سکھائی ہوئی بولیاں بول رہے تھے ''مسلمانو! آؤ یہ تمہاری آزادی کی منزل ہے دیکھو ہم آزاد ہیں یہ جھوٹ ہے کہ تمہیں یہاں پھنسانے کے لیے کوئی جال بچھایا گیا ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہاں اناج بھی ہے اور پانی بھی پاکستان بھوکا ہے۔ تمہیں وہاں یہ نعمتیں نہیں ملیں گی۔ ہمیں دیکھو! ہمیں پہچانو! ہم تمہارے لیڈر ہیں ارے! تم یہ سمجھتے

ہو کہ ہندو تمہیں کھا جائے گا؟ یہ ہندو جس پر تم نے برسوں حکومت کی ہے! کیا یہ بزدلی نہیں کہ تم ہندو سے تحفظات مانگتے ہو؟ خدا کی قسم جب ہندو سے اپنے حقوق لینے کا وقت آئے گا تو ہم اس کے کان پکڑ کر اپنے مطالبات منوائیں گے اگر ہندو کی نیت خراب ہوتی تو ہم اس کے ساتھ کیوں ہوتے؟ وہ لوگ تمہارے خیر خواہ نہیں جنہوں نے تمہیں مہاتما گاندھی جیسے بے ضرر انسان سے بدظن کیا ہے، مہاتما جی نے تمہارے لیے قیدیں کاٹیں، بکری کا دودھ پیا، چرخہ چلایا اور مرن برت رکھے۔ تمہارے یہ لیڈر جو تمہیں مہاتما گاندھی سے بدظن کرتے ہیں، وطن کی آزادی کے دشمن ہیں۔ اسلام کے دشمن ہیں۔ خدا کے دشمن ہیں۔ ان کا ساتھ چھوڑ دو۔ پاکستان کا خیال ترک کر دو۔ آؤ! یہاں آؤ! یہاں دانے اور پانی کی فراوانی ہے، یہاں کوئی خطرہ نہیں آئے گا۔ آؤ! ہمارے ساتھ مل کر نعرہ لگاؤ "انقلاب زندہ باد! انقلاب زندہ باد!!

ایک طرف یہ "بلاوے" کے پرندے ہندو سامراج کی حمایت کے لیے نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت تیار کر رہے تھے اور دوسری طرف ہندو پریس مولے کی مدد سے تلیروں کے پھانسنے کے طریق کار پر عمل کر رہا تھا۔ ہندو مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان سے قبل جب بھی یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان تحفظات کے لیے مصر ہو رہے ہیں، تو انگریز کے خلاف چند نعرے لگا دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح تلیر مولے کو دیکھ کر شکاری اور اس کے پھندے سے بے پروا ہو جاتے ہیں، اسی طرح ہندو کے متعلق مسلمان کے شکوک اور شبہات انگریز دشمنی کے جذبات میں

دب کر رہ جاتے ۔ حریت پسند مسلمان ہندوؤں کا ساتھ دے کر جیلوں میں چلے جاتے، پھر گاندھی جی مرن برت رکھ کر یا کسی اور بہانے سے جیل سے باہر آ جاتے اور حکومت کے ساتھ مصالحانہ باتوں کا دور شروع ہوتا ۔ ہندو کچھ مراعات حاصل کر لیتے یا مراعات حاصل کرنے میں ناکام رہتے ۔ بہر حال مسلمانوں کی مدافعانہ تحریک قصہ ماضی بن کر رہ جاتی ۔

مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ سے بہکانے کے لیے کانگرس نے ان کے سامنے آخری بار انگریز کا ممولا رکھا ۔ چنانچہ ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے یہ نعرے بلند ہونے لگے ''مسلم لیگ انگریز کی آلہ کار ہے ۔ قائداعظم اگر پاکستان کے مطالبہ پر بضد رہا تو انگریز ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر جنگ کے بعد بھی اس ملک میں اپنے پاؤں جمائے رکھے گا ۔ پاکستان مسلمانوں کا مطالبہ نہیں بلکہ انگریز کی شرارت ہے، لہٰذا یہ وطن سے غداری کے مترادف ہے اور اسلام کی تعلیمات کے صریحاً خلاف ۔ اس ملک میں ہندو اور مسلمان کا مسئلہ انگریز نے پیدا کیا ہے ۔ انگریز ہمارا اصلی دشمن ہے ۔''

اور اس کے ساتھ ہی کانگرس مختلف طریقوں سے حکومت پر زور دے رہی تھی کہ وہ پاکستان کے خلاف فوراً کوئی اعلان کرے ورنہ کانگرس اس کی جنگی سرگرمیوں میں رخنہ انداز ہونے سے دریغ نہیں کرے گی ۔ انگریز ہر قیمت پر ہندو کی ناز برداری کے لیے تیار تھا لیکن وہ مجبور تھا ۔

اٹلی، جرمنی اور جاپان کے خلاف لاکھوں مسلمان سپاہی انگریز کے دوش بدوش لڑ

رہے تھے اور انگریز ہندو مہاشوں کے تعاون کی امید پر پاکستان کی مخالفت سے ان لوگوں کے احساسات مجروح کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔

کانگرس کبھی چاپلوسی اور کبھی دھمکیوں سے کام لے رہی تھی۔ اسے اس بات پر اصرار نہ تھا کہ انگریز اس ملک کو فوراً خالی کر دیں، وہ صرف یہ وعدہ لینا چاہتی تھی کہ وہ اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرتے وقت اقلیتوں کو نظر انداز کریں گے۔

1942ء میں یورپ میں ہٹلر کا طوطی بول رہا تھا یورپ کی سلطنتوں کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جرمن افواج روس پر یورش کر رہی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سیل ہمہ گیر کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکے گی۔ جرمنی کی آبدوزیں امریکہ کے ساحلوں کا طواف کر رہی تھیں، لنڈن پر بمباری ہو رہی تھی، کبھی کبھی گاندھی جی کی آتما کو ان باتوں سے دکھ پہنچتا اور وہ فریقین کو عدم تشدد کا سبق دیتے لیکن جب جاپان میدان جنگ میں کود پڑا تو عدم تشدد کے دیوتا نے انگریز کی شکست کے متعلق پر امید ہو کر ہندو سامراج کے احیاء کی تمام توقعات جاپانیوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چنانچہ ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع ہوئی۔ کانگرس کے مہاتما نے کسی زمانے میں کہا تھا کہ کامل آزادی سے میرا مطلب یہ ہے کہ بیرونی حکومت انگریز کی ہو اور اندرونی تسلط ہمارا ہو۔۔۔۔ اب کامل آزادی کے لیے انگریز کی بجائے جاپان کے بیرونی تسلط کے لیے راہ صاف کی جا رہی تھی۔۔۔۔۔ ہندو کو یقین تھا کہ وہ اس نازک موقعے پر اپنے آپ کو انگریز کا دشمن ظاہر کر کے اس ملک کے نئے فاتحین یعنی جاپانیوں کی نگاہ میں انعامات کا مستحق سمجھا

جائے گا۔کم از کم جاپانی مسلم اقلیت کے حقوق کے متعلق اس کے نقطہ نظر کی حمایت ضرور کریں گے۔لیکن یہ شاید مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ جاپانیوں کا سیلاب برما سے آگے نہ بڑھ سکا اور عدم تشدد کے دیوتا کے پجاری چند پل توڑنے، ٹیلیفون کے تار کاٹنے، پوسٹ آفس جلانے، چند بابوؤں کو دھول دھپا کرنے، چند چپراسیوں کی وردیاں پھاڑنے اور بعض سرکاری عمارتوں سے انگریز کا جھنڈا اتار کر اس کی جگہ کانگرس کا جھنڈا لہرانے کے بعد خاموش ہو گئے۔مشرق کا وہ نیا دیوتا جو کانگرسی دیش بھگتوں کے خیال کے مطابق بھارت ماتا کی عظمت رفتہ کو از سر نو زندہ کرنے کے لیے آرہا تھا، منی پور سے آگے نہ بڑھ سکا۔



سلیم ایک ادیب کی حیثیت میں اپنے ہوسٹل کے لڑکوں کا ہیرو بن چکا تھا۔اس کی شاعری میں برسات کی ندیوں کی روانی، پرندوں کی موسیقی اور بہار کے پھولوں کی رعنائی تھی اس کے افسانے اور مضامین دیہاتی زندگی کی مسکراہٹوں اور قہقہوں کے آئینہ دار تھے لیکن اختر جس نے شروع شروع میں اس کی حوصلہ افزائی کی تھی، اب اس کے ادبی رجحانات بدلنے کی کوشش کیا کرتا تھا "سلیم"! وہ کہتا تم بہت اچھا کہتے ہو، تم خوب لکھتے ہو لیکن یہ بے مقصد ادب اس قوم کے لیے مفید نہیں جس کے گرد چاروں طرف سے آلام و مصائب کی آندھیاں گھیرا ڈال رہی ہیں اس میں شک نہیں کہ تمہارے گاؤں کی قمریوں کے ترانے دل کش ہیں، تمہارے باغ کے

پھولوں کی مہک خوشگوار ہے اور تمہارے افسانوں کے دیہاتی کردار بے حد دلچسپ ہیں لیکن تم اس طوفان کو نظر انداز کر رہے ہو جو کسی دن ان دلفریب مسکراہٹوں کو آنسوؤں میں تبدیل کر دے گا اس آگ سے آنکھیں بند کر رہے ہو جو تمہارے خرمن کو راکھ کا انبار بنانے والی ہے، بے شک تمہارے گاؤں کی محفلیں دلچسپ ہیں لیکن اس قوم کے متعلق سوچو، جو ہزاروں برس پہلے اس ملک میں آزادی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس قوم کے شاعر تمہاری طرح برسات کی ندیوں کے نغمے سنتے ہوں گے، موسم بہار کے پھولوں سے باتیں کرتے ہوں گے، اور پھر تمہارے گاؤں کے لوگوں کی طرح وہ اپنی اپنی بستیوں میں محفلیں منعقد کرتے ہوں گے۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر وہ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوں گے، جو تمہارے گاؤں میں ہوتی ہیں لیکن بھیڑیا خصلت انسانوں کا ایک گروہ آیا۔ اس نے یہ بستیاں ان سے چھین لیں اور یہ محفلیں درہم برہم کر ڈالیں جانتے ہو یہ لوگ کون ہیں؟

اور پھر وہ خود ہی جواب دیتا "یہ ہندوستان کے سات کروڑ اچھوت ہیں جو آرین حملہ آوروں کا مقابلہ نہ کر سکے اور مغلوب ہونے کے بعد اس ملک کے سیاسی، روحانی اور اقتصادی یتیم بن کر رہ گئے۔۔۔۔ سلیم! تم کہو گے کہ وہ احمق تھے جو دشمن کے مقابلے میں سر دھڑ کی بازی نہ لگا سکے لیکن ان کے شاعروں اور مفکروں کو کیا کہو گے جو انہیں بر وقت جگا نہ سکے، جو اس وقت بھی جب دشمن سر پر کھڑا تھا، الاؤ کے گرد یا درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر انہیں میٹھے راگ اور دلچسپ کہانیاں سناتے رہے؟ میرے دوست! نفرت اور حقارت کا وہ طوفان جس نے برہمن کی

تقدیس کا لبادہ اوڑھ کر اچھوتوں کو تباہ و برباد کیا تھا، آج صدیوں کے بعد پھر اٹھ رہا ہے اور اس مرتبہ اس کا رخ ہماری طرف ہے۔ ہندو سماج کا احیاء ہندو نیشنلزم کی صورت میں ہو رہا ہے۔ اگر ہم اس طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تو ہمارا حال اچھوتوں سے بھی برا ہو گا۔ اچھوتوں کو ہندو سوسائٹی کا قابل نفرت حصہ بن کر زندہ رہنے کی اجازت مل گئی لیکن ہمارے لیے دو ہی راستے ہوں گے موت یا ترک وطن"

"سلیم!" اختر کے لہجے میں سختی آ جاتی "اگر تم اجتماعی زندگی کا شعور نہیں رکھتے تو کم از کم اس گاؤں کے لیے جس کی حسین فضاؤں میں تم نے نغمے اور قہقہے سیکھے ہیں، آنے والے خطرات کا احساس کرو۔ جب طوفان دوسری ہزاروں بستیوں کو تباہ و ویران کر دے گا تو تمہارا گاؤں اس لیے نہیں بچ رہے گا کہ وہاں تم جیسے شاعر نے پرورش پائی ہے۔ بربریت کے ہاتھ جب ہزاروں محفلیں ویران کریں گے تو تم انہیں یہ کہہ کر نہیں روک سکو گے کہ اس محفل کی طرف مت بڑھو یہاں میں نے مسکرانا اور ہنسنا سیکھا ہے۔ اس وقت تمہیں یہ سمجھ آئے گی کہ اجتماعی آلام و مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت تم کہو گے کہ کاش میں قوم کو میٹھے اور سہانے نغمے سنانے کی بجائے جھنجھوڑ کر جگاتا۔"

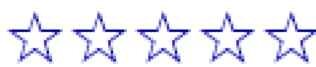
پھر سلیم کا چہرہ دیکھ کر اختر کے لہجے میں ملائمت آ جاتی "سلیم! میری باتیں ذرا تلخ ہیں لیکن میں حقیقت کے چہرے پر حسین پردے نہیں ڈال سکتا۔ قدرت نے جو صلاحیتیں تمہیں دی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ان کا استعمال غلط نہ ہو۔ تمہاری تحریر میں جادو ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ جادو قوم کو سلانے کی بجائے جگانے کے کام آئے۔

موجودہ حالت میں صرف پاکستان ہی ہماری بقا کا ضامن ہوسکتا ہے۔یہی وہ چٹان ہے جس پر کھڑے ہوکر، ہم ہندو فاشزم کے سیلاب کا منہ پھیر سکیں گے۔شاعروں اور ادیبوں نے کئی اقوام کو موت کی نیند سلانے کے لیے لوریاں دی ہیں لیکن ایسے شاعر بھی تھے، جن کے الفاظ نے شکست کھا کر پیچھے ہٹنے والی فوج میں نئی روح پھونک دی۔قرون اولیٰ میں ہمیں ایسے شعراء کی کئی مثالیں ملتی ہیں جو روم و ایران میں اسلام کی عظمت کے پرچم لہرانے والے مجاہدین کے دوش بدوش جہاد کیا کرتے تھے۔۔۔۔آج کا شاعر اگر پاکستان کی اہمیت محسوس نہیں کرتا تو میں کہوں گا کہ وہ اپنے ماحول سے بیگانہ ہے۔"

اختر کے ساتھ ایسی ملاقاتوں کے بعد سلیم اپنے دل میں نئے ارادے اور نئے ولولے لے کر اٹھتا۔اسے اپنے گاؤں کی محفلیں عزیز تھیں اپنے کھیتوں اور باغوں کے پھول پیارے تھے۔اسے ان سیدھے سادھے لوگوں کے قہقہوں اور مسکراہٹوں سے انس تھا جو وقت کو منٹوں اور سیکنڈوں کے پیمانے کی بجائے دنوں مہینوں اور برسوں کے پیمانے سے ناپا کرتے تھے، پھر اسے جگر دوز چیخیں سنائی دیتیں، اپنے گاؤں کی عورتوں اور بچوں کی چیخیں، وہ کپکپا اٹھتا۔۔۔۔وہ اس دیو کو روکنے کے لیے پاکستان کی چار دیواری کی ضرورت محسوس کرتا۔وہ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتا اور پاکستان کے متعلق کوئی مضمون شروع کر دیتا۔وہ ظالم ہیں، وہ سامراجی ہیں، وہ فسطائی ہیں، وہ ہمارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو آریہ فاتحین نے ہندوستان کی مفتوح اقوام کے ساتھ کیا تھا۔۔۔۔لیکن کیوں؟ وہ سوچتا" کیا وہ انسان نہیں؟ کیا

ہم انسان نہیں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ایسا سلوک کیونکر کرسکتا ہے۔۔۔۔؟''

پھر وہ خود ہی جواب دیتا ''کیا ہندوستان کے قدیم باشندے انسان نہ تھے اور برہمن نے انسان ہوتے ہوئے۔۔۔؟ لیکن وہ پرانے زمانے کی باتیں ہیں اب دنیا میں علم کی روشنی پھیل چکی ہے''سلیم اپنے دل کو تسلی دیتا۔ حقیقت کا بھیانک چہرہ تھوڑی دیر کے لیے تصورات کے خوشگوار دھندلکے میں چھپ جاتا اور اس دھندلکے میں اڑتا ہوا وہ اپنے گاؤں میں پہنچ جاتا گاؤں کے چھوٹے بچے اسے دیکھتے ہی شور مچاتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے۔ مسلمانوں کے بچے، سکھوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کے بچے، وہ سب سے پیار کرتا تھا۔۔۔ وہ اس سے لپٹ جاتے۔۔۔کوئی اس کے کندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا کوئی اس کے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ٹھونس دیتا۔ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھ اس کی شلوار یا پتلون کا ستیا ناس کردیتے۔ وہ انہیں کھانڈ کی ٹکیاں یا کوئی اور کھانے کی چیز تقسیم کرتا۔ بچے ایک دوسرے کو پیچھے دھکیل کر اپنا ہاتھ آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ''بھائی جان مجھے دو مجھے دو!''سلیم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ یہ روشنی کا زمانہ ہے وہ مطمئن سا ہو کر قلم رکھ دیتا لیکن اچانک وہ دل کی ایک اور آواز سنتا ''کیا اس روشنی کے زمانے میں ان دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی، جن کے سامنے کبھی اچھوتوں کا بلی دان دیا جاتا تھا۔۔۔۔؟''



کالج کی علمی اور ادبی مجالس کی طرح ہوسٹل کی بزم ادب بھی کبھی کبھی جلسے کیا کرتی تھی۔ان جلسوں میں عام طور پر ٹھوس علمی و ادبی مباحثوں کی نسبت ہنسنے اور ہنسانے کی باتیں زیادہ ہوا کرتی تھیں۔مشاعرہ ہوتا تو سن کر داد دینے والوں کی نسبت سنے اور سمجھے بغیر شور مچانے والوں کی تعداد عام طور پر زیادہ ہوتی اور گھبرائے ہوئے اور سہمے ہوئے نوجوان شعراء کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ انہیں داد مل رہی ہے یا گالیاں!

کسی موضوع پر مباحثہ ہوتا تو ہوسٹل کے زندہ دلوں کا ایک گروہ پہلے ہی فیصلہ کر کے آتا کہ آج کس کے لیے تالیاں بجانی ہیں اور کس کی بات پر قہقہے لگانے ہیں کبھی کبھی لڑکے اختر کو بھی ان جلسوں میں کھینچ لاتے۔اختر اب پاکستان کا مبلغ ہو چکا تھا لیکن اس کے ایک اور ہم جماعت الطاف کو پاکستان کے نام سے چڑ تھی۔وہ گاندھی کو بیسویں صدی کا سب سے بڑا انسان اور اس کے ان مسلمان چیلوں کو اپنا روحانی اور سیاسی پیشوا سمجھتا تھا۔جو رام راج کی ضروریات کے مطابق آیات ربانی کی تفسیریں کیا کرتے تھے کالج میں بھی وہ طالب علموں کے اس گروہ کا لیڈر تھا جو نیشنلسٹ کہلانے کے لیے کبھی کھدر پہن لیا کرتے تھے۔۔۔اختر تقریر کے لیے کھڑا ہوتا تو الطاف اٹھ کر احتجاج کرتا''صاحب صدر!پاکستان ایک اختلافی مسئلہ ہے اختر کی تقریروں سے وطن پرست مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں، اس لیے اس موضوع پر بولنے کی اجازت نہ دی جائے؟''

الطاف کے ساتھی یکے بعد دیگرے اس کی تائید میں کھڑے ہو جاتے۔اس کے

جواب میں اختر کے حامی اٹھتے ''ہم اختر کی تقریر ضرور سنیں گے'' جب دونوں طرف کا جوش و خروش انتہا کو پہنچ جاتا تو آفتاب، چھ فٹ کا ایک قوی ہیکل پٹھان اٹھ کر صاحب صدر کی میز کے قریب آ جاتا اور ایک فیصلہ کن انداز میں کہتا ''الطاف! اگر تم اختر کی تقریر نہیں سن سکتے تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ ہم خود نکال دے گا تم خواہ مخواہ ہر جلسے کو خراب کرتے ہو۔''

سلیم اپنے دونوں ہاتھ الطاف کے کندھوں پر رکھ دیتا الطاف صاحب! تشریف رکھیے نا!!

یہ الفاظ جس قدر نرم ہوتے اسی قدر الطاف کے کندھوں پر ان کا دباؤ نا قابل برداشت محسوس ہوتا ''الطاف صاحب!'' سلیم کے ہاتھوں کی گرفت اور زیادہ سخت ہو جاتی۔ کالج کا ایک اور طالب علم منصور بھی کبڈی کا مشہور کھلاڑی تھا۔ اس کی کلائیاں الطاف کی پنڈلیوں کے برابر تھیں وہ سلیم کا اشارہ پا کر آگے بڑھتا اور مسکراتا ہوا اپنا ایک ہاتھ الطاف کے کندھے پر رکھ دیتا اور اپنے مخصوص انداز میں کہتا'' ارے یار! کیوں سر کھپا رہے ہو بیٹھ بھی جاؤ!''

الطاف بیٹھ جاتا۔ شور اور ہنگامے میں بہت کم لڑکوں کو اس بات کا احساس ہوتا کہ وہ بیٹھا نہیں، بٹھایا گیا ہے۔

سلیم اب دوسرے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بلند آواز میں کہتا'' بھئی بیٹھ جاؤ۔ الطاف صاحب نے اپنا اعتراض واپس لے لیا ہے۔''

الطاف اچانک اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن منصور اور سلیم کے ہاتھوں کے شکنجے میں

بے بس ہو کر رہ جاتا۔

مجلس میں سکون کے آثار دیکھ کر آفتاب کہتا ''دیکھو الطاف! خدا کی قسم اگر اب تم نے تقریر ختم ہونے سے پہلے کوئی شرارت کی تو ہم بہت برا سلوک کریں گے اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو اختر کی تقریر کے بعد اسٹیج پر آجاؤ!''

صدر عام طور پر ہوسٹل ہی کی کوئی مرنجاں مرنج شخصیت ہوتی۔ وہ اکثریت کے فیصلے کا احترام کرتا اور اکثریت کا فیصلہ عام طور پر یہی ہوتا کہ اختر کی تقریر سنی جائے۔



بی اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد سلیم نے اختر کی تقلید کی، اور ایم اے میں داخل ہو گیا۔ کالج اور ہوسٹل میں اختر پاکستان کا ایک ان تھک مبلغ تھا۔ اور اب تک کئی نوجوان اس کے ہم خیال ہو چکے تھے پاکستان کے متعلق ہندو پریس اور پلیٹ فارم سے جو معاندانہ پروپیگنڈہ ہو رہا تھا، اس نے مسلم عوام کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا تھا۔

ہوسٹل کی بزم ادب کے زیر اہتمام ایک مباحثہ ہو رہا تھا جس میں بحث کا موضوع یہ تھا کہ کیا پاکستان ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات کا صحیح حل پیش کرتا ہے؟ اس جلسے میں ہوسٹل کے طلباء کے علاوہ کالج کے دوسرے طلباء کو بھی حصہ لینے کی دعوت دی گئی۔

مباحثے کی تاریخ سے دو دن پہلے اختر کو کھانسی اور زکام کے ساتھ بخار کی

شکایت ہو گئی پہلے دن اس نے ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت محسوس نہ کی دوسرے دن بخار زیادہ شدید ہو گیا اور سلیم ڈاکٹر کو بلا لایا ڈاکٹر نے بتایا کہ اسے نمونیا ہے۔

سلیم اسے ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق دوائی پلاتا رہا۔ رات کے وقت سلیم کے ساتھ آفتاب اور منصور بھی اس کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ دو بجے کے قریب اختر کی آنکھ لگ گئی آفتاب اور منصور اپنے کمروں میں چلے گئے لیکن سلیم وہیں بیٹھا رہا۔

تنہائی سے اکتا کر اس نے اختر کی میز سے ایک کتاب اٹھائی لیکن چند سطریں پڑھنے کے بعد اس نے کتاب پھر میز پر رکھ دی اور دوسری کتاب اٹھالی، اس میں بھی وہ دلچسپی نہ لے سکا۔ اس کے بعد ان کاغذوں کی باری آئی جو اختر کی میز پر بکھرے ہوئے تھے۔ ایک کاغذ کے پرزے پر چند فقرے لکھے ہوئے تھے سلیم نے کاغذ کا یہ پرزہ اٹھا لیا اور بے توجہی سے ایک نظر دیکھنے کے بعد وہیں رکھ دیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے کوئی خیال آیا اور اس نے پھر یہ کاغذ کا پرزہ اٹھالیا۔ وہ فقرے جو اسے پہلی نظر میں بے ربط سے نظر آئے، اب بہت اہم محسوس ہوتے تھے۔۔۔۔ یہ اختر کی تقریر کے نقات تھے۔

سلیم نے چند بار یہ سرخیاں پڑھیں اور پھر کاغذ کا پرزہ میز پر رکھ کر اختر کی طرف دیکھنے لگا اسے اس بات کا افسوس ہو رہا تھا کہ اختر کل بحث میں شریک نہیں ہو سکے گا الطاف اور اس کے ساتھی سخت تیاری کے بعد مباحثے میں حصہ لینے کے لیے آرہے ہیں اختر کی غیر حاضری میں شاید پاکستان کے حق میں بولنے والوں میں سے کوئی ان

کے دانت کھٹے نہ کر سکے۔ اگر انہوں نے میدان مار لیا تو اختر کو یقیناً اس بات کا صدمہ ہو گا پاکستان اختر کے لیے محض ایک نظریاتی مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت تھی یہ وہ مرکز تھا جس کے گرد اس کے خیالات پرواز کیا کرتے تھے۔ وہ ساحل تھا جہاں پہنچنے کے لیے وہ بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔۔۔۔۔ یہ وہ نعرہ تھا جس میں اس کی زندگی کے تمام نغمے گم ہو چکے تھے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ پاکستان کے لیے میں اپنے دل میں دس کروڑ مسلمانوں کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہوں ایک دن میری آواز دس کروڑ مسلمانوں کی آواز ہو گی اگرچہ ہماری راہ میں کانٹوں کی باڑیں کھڑی کی جائیں گی لیکن ہم انہیں روندتے ہوئے منزل مقصود تک پہنچ جائینگے ایک دن اس نے کہا تھا "سلیم! تم میں ابھی تک اجتماعی زندگی کا شعور پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک تم یہ سمجھتے ہو کہ وقت کا بہترین مصرف اس قسم کے افسانے لکھنا اور شعر کہنا ہے لیکن وہ دن دور نہیں جب تم یہ محسوس کرو گے کہ ان چند لمحات کے سوا جن میں تم نے پاکستان کے لیے کوئی عملی کام کیا ہے، تمہاری باقی زندگی بے حقیقت تھی آج تم کسی فرضی محبوب کے کوچے کی خاک کو سرمایہ حیات سمجھتے ہو لیکن وہ دن دور نہیں جب تمہیں پاکستان کی ایک ایک انچ زمین کو دشمن سے بچانے کے لیے زندگی کی عزیز ترین خواہشات کو قربان کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ سلیم! میں تمہیں افق افق پر اٹھنے والی آندھی کے آثار دکھا رہا ہوں اور تم اسے میرا وہم سمجھتے ہو لیکن جب یہ آندھی آئیگی تو تم محسوس کرو گے کہ پاکستان کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں میں بارش سے پہلے مکان پر چھت ڈالنا چاہتا ہوں اور تم بارش

میں کھڑے ہو کر چھت ڈالنے کی فکر کرو گے میرے دوست! پاکستان کی جنگ ایک اجتماعی فریضہ ہے اور اگر تم اپنی موت وحیات دس کروڑ مسلمانوں کی موت وحیات سے وابستہ کر چکے ہو تو اس سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتے سلیم! آؤ! میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلو تاکہ اگر کہیں میرے پاؤں لڑکھڑا جائیں تو میں تمہارے مضبوط بازوؤں کا سہارا لے سکوں۔ کم از کم مجھے یہ تسلی ضرور ہو گی کہ میں تنہا نہیں لیکن کل تمہیں زخمیوں اور اپاہجوں کو اٹھا کر پاکستان کی منزل کا رخ کرنا پڑے گا۔"

"اختر تم تنہا نہیں ہو، میں تمہارے ساتھ ہوں!" سلیم اپنے دل میں نئے ولولے اور نئی امنگیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے میز سے قلم اٹھایا اور کورے کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہو گیا۔۔۔ اس نے رک رک کر چند ابتدائی سطور لکھیں لیکن اس کے بعد وہ اپنے قلم میں بلا کی روانی محسوس کر رہا تھا۔

جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا تو صبح کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔ نماز کے بعد وہ اپنے مضمون پر نظر ثانی کرنے کیلئے کرسی پر آ بیٹھا رات کی بے آرامی کے باعث اس کا سر چکرا رہا تھا تھوڑی دیر ستانے کی نیت سے اس نے میز پر اپنی کہنیاں ٹیک دیں اور کلائیوں پر سر رکھ دیا چند منٹ بعد اسے نیند آ گئی۔

آفتاب کمرے میں داخل ہوا تو اختر دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بستر پر بیٹھا سلیم کا مضمون پڑھ رہا تھا۔ "بھئی اختر! اپنی جان پر اتنا ظلم نہ کرو" یہ کہتے ہوئے آفتاب نے اس کے ہاتھ سے کاغذ چھین لیے اور پھر اس کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا" بھئی تمہارا بخار ابھی اترا نہیں، ذرا کم ہوا ہے۔ خدا کے لیے آج مباحثے میں حصہ

لینے کا خیال چھوڑ دو۔ ہم تمہاری جگہ کسی اور کو بھرتی کر لیں گے۔''

اختر نے اطمینان سے کہا ''آفتاب! یہ پڑھو تو سہی!''

''بھئی میں پڑھے بغیر بھی تمہیں داد دینے کے لیے تیار ہوں لیکن ایسی کیا مصیبت تھی کہ تم رات کے وقت اٹھ کر لکھنے کے لیے بیٹھ گئے۔۔۔۔اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں ساری رات تمہاری رکھوالی کرتا۔''

''بھئی آہستہ بات کرو، سلیم سو رہا ہے۔''

''سلیم بھی کیسا نالائق ہے جس نے تمہیں منع نہیں کیا۔''

''میں بھی اٹھا ہوں معلوم نہیں ڈاکٹر کی دوا کیا تھی۔ میں نے تو کروٹ بھی نہیں بدلی۔ یہ سلیم کا کارنامہ ہے۔''

''لیکن یہ ہے کیا؟''

''بھئی یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے''

آفتاب اختر کے قریب بستر پر بیٹھ گیا چند سطور بے توجہی سے دیکھنے کے بعد اس نے مضمون کو دوبارہ شروع سے پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ خاموشی سے پڑھنے کی بجائے اختر کو سنا رہا تھا الفاظ اور فقروں کی ترتیب اس کی آواز میں زیر و بم پیدا کر رہی تھی۔

اس تحریر میں اس پہاڑی ندی کی روانی اور موسیقی تھی جو کبھی سنگریزوں اور چٹانوں سے ٹکرا کر شور مچاتی ہے اور کبھی ہموار زمین میں پہنچ کر اچانک اپنی بلند تانیں گہرے اور میٹھے سروں میں تبدیل کر دیتی ہے۔ پھر ایک اور ڈھلوان آجاتی ہے اور

یہ سر آہستہ آہستہ ابھرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ایک گہرے کھڈ کے سرے پر پہنچ کر یہ ابھرتی ہوئی تانیں ایک آبشار کے ہنگاموں میں تبدیل ہو جاتی ہیں سلیم کبھی پاکستان کے باغ کے متعلق ایک شاعر کا تصور پیش کر کے فرزندان قوم کو ان طوفانوں سے خبردار کر رہا تھا، جن کی آغوش میں ہزاروں تخریبی عناصر چھپے ہوئے تھے۔۔۔۔

اور کبھی دلائل کے پہاڑ پر کھڑا ہو کر پاکستان کے مخالفین پر مہیب چٹانوں کی بارش کر رہا تھا۔ آخری چند فقرے آفتاب نے کچھ ایسے جوش و خروش سے ادا کیے کہ سلیم گہری نیند سے جاگ اٹھا۔ آفتاب اور اس سے زیادہ اختر کے چہرے پر اپنی تحریر کے اثرات دیکھ کر اس نے اپنے دل میں خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔ مضمون ختم ہوا اور وہ دونوں سلیم کی طرف دیکھنے لگے۔

آفتاب نے کہا ’’بھئی سلیم! میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں تم نے پہلی بار اپنے قلم کا صحیح استعمال کیا ہے اب وقت بہت تھوڑا ہے لیکن اگر تم یہ تقریر یاد کر لو تو بہت اچھا ہو گا۔ الطاف اختر کی بیماری پر بہت خوش ہے۔‘‘

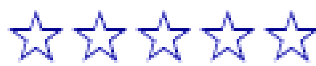
سلیم نے کہا ’’بھئی میں نے یہ تقریر مباحثے میں حصہ لینے کی نیت سے نہیں لکھی تھی میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر اختر کی تقریر کی سرخیاں دیکھیں اور لکھنے بیٹھ گیا اور اب معلوم نہیں میں کیا لکھ چکا ہوں۔‘‘

اختر نے کہا ’’سلیم! بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں بروقت اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں ان کا مشن کیا ہے بعض آدمیوں میں قوم کے سپاہی بننے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں قدرت انہیں قوم کی عزت اور آزادی کا محافظ بنا کر بھیجتی

ہیں لیکن وہ شاعر، قوال اور گویے بن جاتے ہیں بعض محض شاعر ہوتے ہیں اور وہ قوم کی بدقسمتی سے لیڈر بن جاتے ہیں۔ بعض قدرت کی طرف سے بلند پایہ موجد کا دماغ لے کر آتے ہیں لیکن اپنی تن آسانی کے باعث داستان گو بن جاتے ہیں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے دل و دماغ میں غایت درجہ کی انفرادیت لے کر آتا ہے لیکن قوم کی اجتماعی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے وہ اپنی انفرادیت قربان کر دیتا ہے۔ وہ ایک شاعر ہے، ایک ادیب ہے۔ اس کا دل ایک رباب ہے جس کے نازک تاروں کے لیے کلیوں کی مسکراہٹ مضراب کا کام دیتی ہے۔ وہ ایک مصور ہے جس کے دل میں قدرت نے قوس قزح کے رنگ بھر دیے ہیں۔ وہ ایک مغنی ہے جس نے آبشاروں اور پرندوں کے نغمے چرائے ہیں لیکن قوم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں، قوم کے بیٹے خاک و خون میں لوٹ رہے ہیں، قوم کی بیٹیوں کی عصمت خطرے میں ہے۔ ایسے دور میں یہ لوگ اپنی انفرادی خواہشات کو قوم کی اجتماعی ضروریات پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں شاعر پھولوں کی مسکراہٹ کی بجائے قوم کے معصوم بچوں کی جگر دوز چیخوں سے متاثر ہوتا ہے وہ قوم کو لوریاں نہیں دیتا بلکہ جھنجھوڑتا ہے۔ مصور قلم پھینک کر تلوار اٹھا لیتا ہے اور مغنی کے نغموں میں پرندوں کے چہچہوں کی بجائے تیغوں کی جھنکار اور توپوں کی دنا دن سنائی دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے ابھی تک ہمارے شاعروں اور ادیبوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے موجودہ حالات کا صحیح جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہ قوم کے افراد میں اجتماعی شعور اور اجتماعی سیرت بیدار کرنے کی بجائے ایک ایسا ذہنی

انتشار پیدا کر رہے ہیں، جو موجودہ حالات میں ہمارے لیے بے حد خطرناک ہے دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں کھڑا ہمیں للکار رہا ہے اور ہمارا شاعر قوم کے نوجوانوں سے کہہ رہا ہے۔ ''ٹھہرو! میں تمہیں ایک نیا گیت سناتا ہوں۔ میں نے ایک نئی نظم لکھی ہے یہ ادب برائے ادب ہے یہ نئے دور کی ابتدا ہے ہم ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی پر سوار پاکستان کی منزل کا رخ کر رہے ہیں ہمیں ہر قدم پر ایک نیا بھنور دکھائی دے رہا ہے اور کشتی کے ایک کونے میں ہمارا آرٹسٹ اپنے رباب کے تار درست کر رہا ہے۔ سلیم! مجھے تمہاری تحریر نے اس لیے متاثر نہیں کیا کہ اس میں ایک شاعر اور ادیب کے دل کی دھڑکنیں ہیں بلکہ میں اس لیے متاثر ہوا ہوں کہ تم نے پہلی بار سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے کی طرف توجہ دی ہے جس کے ساتھ دس کروڑ مسلمانوں کی موت و حیات وابستہ ہے خدا کرے کہ یہ تمہارے شعر و ادب کے نئے دور کی ابتدا ہو میں اس مباحثے میں حصہ نہیں لوں گا۔ اب ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کرنے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن تمہاری تقریر ضرور سنوں گا۔

آفتاب نے کہا ''بھئی آج سلیم کی جگہ تم شاعر بن گئے ہو۔ اب خدا کے لیے لیٹ جاؤ اور سلیم! تم اپنے کمرے میں جا کر تقریر کی تیاری کرو۔''



شام کے آٹھ بجے ہوسٹل کے کامن روم میں مباحثہ ہو رہا تھا صدارت کے فرائض کالج کے ایک نوجوان پروفیسر سرانجام دے رہا تھا۔ اختر اپنے کمرے کی

بجائے کامن روم کے قریب ایک اور کمرے میں لیٹا مباحثے میں حصہ لینے والوں کی تقریریں سن رہا تھا۔ منصور اس کی تیمارداری سے زیادہ آزادی کے ساتھ حقہ پینے کی نیت سے اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس باہر کی طرف کھلنے والے دریچے سے مقررین کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

الطاف اور اس کے ساتھیوں کی تقریروں میں پاکستان کے کلاف وہی دلائل تھے جو بارہا ہندو اخبارات میں دہرائے جا چکے تھے اختر کے ہونٹوں پر کبھی حقارت آمیز مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور کبھی غصے کی حالت میں وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا اور منصور تقریر کے الفاظ سے زیادہ اس کے چہرے سے متاثر ہو کر بار بار کہتا "بکواس کر رہا ہے گدھا کہیں کا اب آفتاب اس کی خبر لے گا۔"

الطاف اپنے گاندھی بھگت ساتھیوں کا ایک منظم گروہ لے کر آیا تھا اور وہ اس کی تقریر کے دوران میں بار بار تالیاں بجا رہے تھے جب آفتاب کی باری آئی تو اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت زیادہ خفا ہو چکا ہے۔ اس کی تقریر پاکستان کے مخالفین کے خلاف ایک اعلان جنگ تھی اور سننے والے یہ محسوس کر رہے تھے کہ اگر صدر کا احترام ملحوظ خاطر نہ ہوتا تو وہ شاید اپنے جذبات کا عملی مظاہرہ کرنے پر اتر آتا۔

پاکستان کی حمایت میں ایک ایم اے کے طالب علم کی تقریر نہایت عالمانہ تھی لیکن اپنی باریک آواز کے باعث وہ سننے والوں کو زیادہ متاثر نہ کر سکا۔

بالآخر صاحب صدر نے کہا "اب مسٹر سلیم موضوع کے حق میں تقریر کریں گے"

سلیم کرسی پر بیٹھا ان کاغذات کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا ان پر اس نے رات کے وقت تقریر لکھی تھی یہ تقریر اسے حفظ ہو چکی تھی لیکن الطاف کی تقریر یا نا خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا تھی جس نے اس کے خیالات کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ سلیم اس کی تقریر کے دوران میں محسوس کر رہا تھا کہ خیالات کے وہ ''حسین پھول'' جو اس نے جمع کیے ہیں اپنی رنگینی اور رعنائی کے باوجود الطاف کا منہ بند کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس نے گالیوں کے جواب میں شعر لکھے ہیں الطاف کے بعد اس کے ساتھیوں کی تقریروں کے دوران میں بھی وہ اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا اور اس کے ذہن میں نئے نئے دلائل اور نئے نئے الفاظ آ رہے تھے، یہاں تک کہ جب اسے تقریر کے لیے بلایا گیا تو اسے یقین نہ تھا کہ وہ کیا کہے گا وہ جھجکتا ہوا کرسی صدارت کے قریب پہنچا تو اپنی لکھی ہوئی تقریر سے زیادہ مخالفین کی تقریروں کے الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔

الطاف نے اچانک کہہ دیا ''سلیم صاحب! پاکستان کے متعلق تقریر کریں گے یا کوئی قصیدہ سنائیں گے؟''

آفتاب نے فوراً جواب دیا ''سلیم صاحب ملت فروشوں کا مرثیہ پڑھیں گے۔''

حاضرین تھوڑی دیر شور مچاتے رہے۔ بالآخر صدر نے اٹھ کر انہیں خاموشی کی تلقین کی سلیم نے مذبذب سی آواز میں تقریر شروع کی چند فقرے کہنے کے بعد سلیم نے لکھے ہوئے کاغذات ایک نظر دیکھنے کے بعد میز پر رکھ دیے اور قدرے توقف کے بعد دوبارہ تقریر کرنے لگا۔ الفاظ رک رک کر اس کی زبان پر آ رہے تھے۔

حاضرین میں کانا پھوسی شروع ہو چکی تھی۔ لیکن اچانک وہ سنبھل گیا اس کی آواز صاف اور بلند ہوتی گئی وہ خیالات کی ایک نئی رو میں بہہ رہا تھا وہ کہہ رہا تھا:

''حضرات! اگر الطاف صاحب اور ان کے ساتھی متحدہ ہندوستان کی حمایت میں تقریریں کرنے سے نہیں شرماتے تو مجھے پاکستان کے متعلق قصائد لکھنے میں عار نہیں متحدہ ہندوستان الطاف صاحب کو ہندو اکثریت کی غلامی کا طوق پہناتا ہے اور پاکستان مجھے ایک آزاد قوم کے فرد کی حیثیت عطا کرتا ہے، اگر انہیں ہندو کی دائمی غلامی اور ذلت کا شوق ہے تو مجھے عزت اور آزادی سے محبت ہے لیکن کاش! یہ مسئلہ میری اور الطاف صاحب کی ذات یا ان لوگوں تک محدود ہوتا جنہوں نے اس بحث میں حصہ لیا ہے۔ اس صورت میں ہماری بحث اپنے اپنے ذاتی خیالات کی ترجمانی تک محدود رہتی لیکن یہ دو قوموں کا مسئلہ ہے۔ یہ دو نظریوں اور دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ یہ ہندو اور مسلمان کے مفادات کی ٹکر ہے۔ ہندو متحدہ ہندوستان چاہتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر مسلمانوں پر دائمی تسلط رکھ سکے۔ درہ خیبر سے لے کر آسام کی پہاڑیوں تک رام راج کے جھنڈے لہرا سکے اور حکومت کے اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد وہ کسی دقت کے بغیر مسلمانوں کو برہمو سماج کا قابل نفرت حصہ بنا سکے۔''

مسلمان پاکستان چاہتے ہیں اس لیے کہ وہ ایک قوم ہیں اور ایک

قوم کو بڑھنے، پھولنے اور پنپنے کیلئے آزاد وطن کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان ہیں اور ایک انسان دوسرے انسان کی غلامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ جب مسلمان پاکستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں وہ دفاعی مورچہ ہوتا ہے جہاں اسے ہندو اکثریت کے جارحانہ مقاصد سے نجات مل سکتی ہے اور جب ہندو متحدہ ہندوستان کا نعرہ لگاتا ہے تو اس کے ذہن میں ایک ایسی وسیع شکارگاہ ہوتی ہے جہاں اکثریت کے بھیڑیے کسی روک ٹوک کے بغیر اقلیت کی بھیڑوں کا شکار کھیل سکتے ہیں۔

ہندو پاکستان کے خلاف متحد اور منظم ہو چکا ہے۔ مہا سبھائی ہندو، کانگرسی ہندو، سناتن دھرمی ہندو، آریہ سماجی ہندو، تشدد پر ایمان رکھنے والا ہندو اور عدم تشدد کی تبلیغ کرنے والا ہندو، بظاہر مسلمانوں کو امن اور شانتی کا پیغام دینے والا ہندو، اور در پردہ مسلمانوں کی سرکوبی کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کرنے والا ہندو سب ایک ہو چکے ہیں اور اگر ہم نے اپنے مستقبل سے آنکھیں بند نہیں کر لیں تو ہمیں بھی ایک ہونا پڑے گا۔ یاد رکھیے! اگر ہم اجتماعی نجات کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ نہ دے سکے تو مشترکہ تباہی میں ایک دوسرے کے ساتھی ضرور ہوں گے۔

ہندو سارے ہندوستان میں اپنے دیوتاؤں کے مندر تعمیر کرنا چاہتا

ہے۔وہ اپنے اس ماضی کی طرف لوٹنے کے لیے بے قرار ہے جب وہ اپنے گناہوں کے بدلے اچھوت کا بلیدان دیا کرتا تھا۔اور مسلمان ہندوستان کے ایک گوشے میں اپنی ان مساجد کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں جہاں توحید کے چراغ روشن ہیں جہاں ذات پات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو عدل اور مساوات کا پیغام ملتا ہے۔ ہندو اکھنڈ ہندوستان میں برہمن کا اقتدار چاہتا ہے، مسلمان پاکستان میں خدا کی بادشاہت چاہتا ہے لیکن آج تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ نیشنلسٹ یا گاندھی بھگت مسلمان کیا چاہتے ہیں؟

آفتاب نے دبی زبان سے کہہ دیا ''دال روٹی'' اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

سلیم نے قدرے توقف کے بعد اپنی تقریر پھر شروع کی:

''یہ لوگ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کے علیحدہ وجود سے منکر ہیں ان کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ فرقہ پرستی، تنگ نظری اور رجعت پسندی ہے اور ان خطرناک الزامات سے بچنے کی یہی ایک صورت ہے کہ دس کروڑ مسلمانوں کو متحدہ قومیت کی رسی سے جکڑ کر اس تاریک گڑھے میں پھینک دیا جائے، جہاں سے ابھی تک اچھوت کے کراہنے کی آواز آرہی ہے۔ یہ وطن پرست ہیں اور وطن کا دیوتا دس کروڑ مسلمانوں کا بلیدان لیے بغیر خوش نہیں ہوسکتا۔ یہ اقتصادیات کے ماہر ہیں اور انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ پاکستان بھوکا اور ننگا ہوگا

لیکن کاش! یہ دردمند ان قوم ذرا جرأت سے کام لیں اور یہ کہہ دیں کہ انہیں اپنی دال روٹی کی فکر ہے اگر پاکستان بن گیا تو یہ اس من وسلویٰ سے محروم ہو جائیں جو ان کے لیے وار دھا کے آسمانوں سے نازل ہوتا ہے۔"

میں آزادی کی نعمت کو روٹیوں کے ساتھ تولنے کا قائل نہیں، تاہم وہ ہندو جو پاکستان کی بھوک کے تصور سے گھلے جا رہے ہیں، اگر حق گوئی سے کام لیں تو انہیں یہ کہنا پڑے گا کہ اگر پاکستان کے زرعی صوبے ان کے ہاتھ سے نکل گئے تو انہیں گندم کی بجائے کوئی اور غذا تلاش کرنی پڑے گی اگر پاکستانیوں کو کپڑے کی ضرورت ہے تو دنیا بھر کے کارخانہ دار پاکستان کی روئی کے محتاج ہیں۔

یہ لوگ فنون حرب کے بھی ماہر ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان دفاعی لحاظ سے بھی کمزور ہوگا۔ لہذا ان کی قیمتی رائے کا احترام کرتے ہوئے ہمیں پاکستان کے قیام کا خیال ترک کر دینا چاہیے اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر ہندو کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لینا چاہیے۔۔۔ پاکستان کی فتح یا شکست کا فیصلہ تو کسی پانی پت کے میدان میں ہوگا لیکن یہ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگ موت سے پہلے ہی اپنی قبریں کھود چکے ہیں۔ پاکستان کے دفاع کو اگر کوئی خطرہ ہوگا تو وہ ان شکست خوردہ لوگوں کی طرف سے ہوگا۔ میں انہیں اطمینان دلاتا

ہوں کہ ان کی پیشانیوں پر ملت فروشی کا جو داغ آج ہم دیکھ رہے ہیں، اسے کل تک ہر شخص پہچان سکے گا۔ یہ لوگ زیادہ عرصہ قوم کو اپنے نیک مشوروں سے مستفید نہیں کر سکیں گے۔ یہ لوگ امن پسند ہیں اور ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے نعرے سے ہندو مہاشے خفا ہو جاتے ہیں اور اس سے آپس کا فساد بڑھتا ہے اور فساد بڑھنے سے گاندھی کی آتما کو دکھ ہوتا ہے لہٰذا اگر مسلمان پاکستان کا خیال ترک کر کے ہندو اکثریت کی دائمی غلامی قبول کر لیں تو نہ ہندو مہاشہ خفا ہو گا نہ فساد بڑھے گا اور نہ گاندھی جی کی آتما کو دکھ ہو گا اور سب سے زیادہ یہ کہ دنیا ہمیں تنگ نظر اور فسادی کے نام سے یاد نہیں کرے گی۔ یعنی اگر ہم اپنی خوشی سے اکھنڈ ہندوستان کے سیاسی قبرستان میں دفن ہونے کیلئے تیار ہو جائیں تو آثار قدیمہ کے ماہرین ہمارا مزار دیکھ کر یہ کہا کریں گے کہ یہ ہے وہ قوم جس نے ہندو کو اپنی شرافت، امن پسندی، نیک نیتی اور وسیع النظری کا ثبوت دینے کے لیے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا تھا۔ یہاں دہلی کی جامع مسجد اور لال قلعہ کے معماروں کے وہ جانشین دفن ہیں جنہوں نے بیسویں صدی میں ہندو اقتدار کا محل کھڑا کرنے کے لیے اپنے جھونپڑوں کو آگ لگا دی تھی۔ یہ ان امن پسند بھیڑوں کی ہڈیوں کا انبار ہے جنہوں نے بھیڑیوں کو اپنا نگہبان بنا لیا تھا۔

پاکستان کو اس ملک میں ہم اپنا آخری دفاعی مورچہ سمجھتے ہیں، یہ

ہندو فسطائیت کو روکنے کے لیے ہماری آخری دیوار ہے ہم ہندو کو زندہ رہنے کا حق دیتے ہیں۔ ہم اس کی آبادی کی نسبت سے ہندوستان کے تین چوتھائی بلکہ اس سے بھی زیادہ حصے پر اس کی حکومت کا حق تسلیم کرتے ہیں لیکن ہندو کو اپنی آزادی سے زیادہ ہمیں غلام بنانے کی فکر ہے۔ جب ہندو مسلمانوں کی ہمدردی کا لبادہ اوڑھ کر پاکستان کی مخالفت کرتا ہے تو اس کی مثال اس ڈاکو سے مختلف نہیں ہوتی جو اپنے ہمسائے سے یہ کہہ رہا ہو۔ بھائی دیکھو تم اپنے گھر کے گرد چار دیواری کیوں بنا رہے ہو؟ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ تم مجھے ڈاکو سمجھتے ہو ایسی غلط فہمیوں سے بھائی چارے میں فرق آتا ہے اس لیے میں تمہیں یہ دیوار تعمیر کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہوشیار ڈاکو عام طور پر گھر کے کسی بھیدی کو ساتھ ملا لیتے ہیں یہ گھر کا بھیدی آ کر مالک سے کہتا ہے ارے یار! یہ کیا مصیبت ہے کہ تم ساری رات لٹھ اٹھائے دروازے پر پہرا دیتے ہو، جاؤ! اطمینان سے سو جاؤ۔ ورنہ پڑوسی یہ خیال کریں گے کہ تم انہیں چور سمجھتے ہو۔ حضرات! یہ کانگرسی مسلمان ہمارے گھر کے بھیدی ہیں۔

الطاف اور اس کے چند ساتھی یکے بعد دیگرے احتجاج کے لیے اٹھے لیکن ان کی آواز مخالفین کے نعروں اور قہقہوں میں دب کر رہ گئی ''بیٹھ جاؤ! بیٹھ جاؤ! پاکستان زندہ باد! گھر کے بھیدی مردہ باد''

الطاف چلایا ’’صاحب صدر! سلیم کی تقریر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔‘‘

آفتاب نے اٹھ کر کہا ’’نہیں، ہم سنیں گے!‘‘

اکثریت نے آفتاب کی تائید کی اور صدر نے کہا ’’میرے خیال میں دونوں فریق یہاں سمجھنے اور سمجھانے کی نیت سے آئے ہیں۔ اس لیے میں مسٹر سلیم کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت دیتا ہوں۔ اسکے بعد حزب مخالف کا لیڈر کچھ کہنا چاہے تو میں اسے موقع دینے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

حاضرین کی اکثریت نے تالیوں کے ساتھ صدر کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا اور سلیم نے دوبارہ اپنی تقریر شروع کی:

’’حضرات! اگر میں پاکستان کو محض ایک علمی اور نظریاتی مسئلہ سمجھتا، تو شاید اس بحث میں حصہ نہ لیتا۔ مجھے تقریر کرنے کا شوق نہ تھا۔ پاکستان کا مسئلہ ہماری موت و حیات کا مسئلہ ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ طوفان بڑی تیزی سے آ رہا ہے اور جو لوگ آج پاکستان کا تمسخر اڑا رہے ہیں، کل اس کی چار دیواری کو اپنی آخری جائے پناہ خیال کریں گے۔ جب دوپہر کی جھلستی ہوئی ہوا چلتی ہے تو منتشر قافلے خود بخود درختوں کی چھاؤں میں جمع ہو جاتے ہیں میں ہندو کے قہر و غضب سے پریشان نہیں بلکہ اسے قیام پاکستان کے لیے ایک نیک فال سمجھتا

ہوں پاکستان کی مخالفت میں اس کا متحدہ محاذ ہمیں پاکستان کی حمایت میں متحدہ محاذ بنانے پر مجبور کر دے گا۔ لیکن میں آپ کو ان نام نہاد مسلمانوں سے خبردار کرنا چاہتا ہوں جو پاکستان کی مخالفت اور ''رام راج'' کے جواز میں قرآن پاک کی آیات پیش کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔۔۔۔۔ جب بغداد پر تاتاریوں کا حملہ ہونے والا تھا، اس قسم کے لوگوں نے مسلمانوں کو مناظروں میں الجھائے رکھا۔ آج جب ہندو ہم پر یلغار کرنے کے لیے راشٹریہ سیوک سنگھ اور اکالی دل کی فوجیں تیار کر رہا ہے تو ان لوگوں نے پاکستان کو موضوع بحث بنا رکھا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ جس وقت تک ہندو کی تیاری مکمل نہیں ہو جاتی، جب تک ان کے مندر اور سکھوں کے گوردوارے بم سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل نہیں ہو جاتے، یہ لوگ ہمیں ذہنی انتشار میں مبتلا رکھیں گے۔ ان لوگوں کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث شاید پاکستان کے متعلق مسلمانوں کی جدوجہد چند برس اور محض تقریروں، قراردادوں اور نعروں تک محدود رہے اور ہمیں مورچہ بنانے کی اس وقت فکر ہو جب دشمن چاروں طرف سے گولہ باری کر رہا ہو۔''

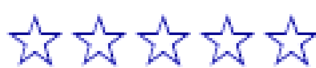
ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ قیام پاکستان عملی جدوجہد کے بغیر ممکن نہیں ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری آزادی اور بقا کے دشمن کیل کانٹے سے لیس ہو رہے ہیں اور ہم اگر مکمل تباہی نہیں چاہتے تو ہمیں

پاکستان یا موت کا نعرہ لگا کر میدان میں آنا پڑے گا۔

ہم ان لوگوں کی چیخ پکار سے پریشان کیوں ہوں، جو ہمارا ساتھ چھوڑ کر غیروں کی کشتی میں سوار ہو چکے ہیں جو رب کعبہ سے منہ پھیر کر بھارت کے دیوتاؤں پر ایمان لا چکے ہیں ہمیں اپنی ساری توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول کر دینی چاہیے جو اسلام کے لیے زندہ رہنا اور اسلام کے لیے مرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان لوگوں کو عملی جدوجہد کے لیے تیار کرنا ہے۔ ہمیں ملک کے ہر گوشے میں یہ پیغام پہنچانا ہے کہ اب اپنی عزت، آزادی اور بقا کے لیے آگ اور خون میں کھیلنے کا وقت آ گیا ہے۔

میرے دوستو! اب تقریروں، قراردادوں اور بیان بازی کا وقت نہیں۔ عمل اور حرکت کا وقت ہے۔

سلیم کی تقریر کے بعد الطاف اور اس کے ساتھیوں کا جوش و خروش بہت حد تک ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ صدر نے الطاف کو دوبارہ اسٹیج پر آنے کی دعوت دی، تو وہ قدرے تذبذب کے بعد اٹھا لیکن کسی نے بلند آواز میں نعرہ لگا دیا ''گھر کا بھیدی'' اور آفتاب نے ''لنکا ڈھائے'' کہہ کر فقرہ پورا کر دیا۔ کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور الطاف نے اسٹیج تک پہنچنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔



جب مجلس برخاست ہوئی تو سلیم کے چند دوست اس کے گرد جمع ہو گئے۔ کچھ دیر ان کی داد و تحسین سننے کے بعد سلیم کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''سلیم صاحب السلام علیکم!''

یہ دلکش آواز سلیم کے کانوں سے ہوتی ہوئی دل تک اتر گئی۔ سلیم نے وعلیکم السلام کہہ کر پیچھے دیکھا۔۔۔ ایک خوش وضع نوجوان مسکرا رہا تھا۔ سلیم پہلی نگاہ میں اسے پہچان نہ سکا لیکن اس کے دل کی دھڑکنیں کہہ رہی تھیں کہ تم نے اسے دیکھا ہے، تم اسے جانتے ہو، تم اس آواز سے آشنا ہو۔ دوسری نگاہ میں ماضی کے حسین اور دلفریب نقوش دماغ کی گہرائیوں سے نکل کر شعور کی سطح پر آ گئے۔ سلیم کی آنکھوں کے سامنے سادہ اور معصوم مسکراہٹیں رقص کرنے لگیں۔ اس کے کانوں میں دلکش قہقہے گونجنے لگے، وہ بے اختیار ''ارشد! ارشد!'' کہتا ہوا نو وارد سے لپٹ گیا ''تم کب آئے؟ تم کہاں تھے؟ اتنی دیر تم کہاں غائب رہے؟ تم نے مجھے خط تک نہیں لکھا۔۔۔'' سلیم جواب کا انتظار کیے بغیر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا۔

اچانک اسے اپنے اردگرد دوسرے لڑکوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے کہا ''چلو کمرے میں بیٹھتے ہیں''

ارشد اس کے ساتھ چل دیا۔ سلیم نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا بجلی کا بٹن دبایا اور ارشد کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود چارپائی پر بیٹھ گیا اب وہ قدرے اطمینان سے اپنے سوالات دہرا رہا تھا۔

ارشد نے ان سوالات کے جواب میں مختصراً اپنی سرگزشت بیان کر دی۔ ''میں

امرتسر کے میڈیکل سکول سے فارغ التحصیل ہو چکا ہوں۔ اب تم مجھے چھوٹا سا ڈاکٹر کہہ سکتے ہو۔ فوج کو اپنی خدمات پیش کر چکا ہوں۔ خیال ہے کہ جلد ہی بلا لیا جاؤں گا۔ لاہور میں میرے خالو بیمار تھے میں ابا جان کے ساتھ ان کی تیمارداری کے لیے آیا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کی مزاج پرسی سے زیادہ تمہیں دیکھنے کی خواہش تھی۔ شام کو یہاں پہنچا تو مباحثہ ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ہے کہ تمہاری تقریر بھی سن لی۔ اگر پاکستان کے لیے کوئی فوج بھرتی کر رہے ہو تو میرا نام بھی لکھ لو۔''

سلیم نے پوچھا ''لاہور کب آئے؟''

''بس ہم کوئی چار بجے یہاں پہنچے تھے''

''لیکن تمہیں میرے متعلق کیسے معلوم ہوا؟''

''بھئی میں تمہارے گاؤں سے بھی ہو آیا ہوں''

''کب؟''

''پچھلے مہینے آخری ہفتے کے روز میں، ابا جان اور امی وہاں گئے تھے رات ہم وہاں رہے اور اتوار کی شام واپس چلے آئے۔''

''اور اس کے بعد بھی تم نے مجھے خط نہ لکھا!''

''بھئی میں نے خط کی بجائے خود لاہور آنے کا ارادہ کیا تھا''

''تو پھر مجھے تمہارے خالو جان کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے بیمار ہو کر تمہیں اس نیک ارادے کی تکمیل کا موقع دیا۔۔۔ اچھا میں تمہارے لیے کھانا منگواتا ہوں ابھی تک میں نے خود بھی نہیں کھایا۔''

ارشد نے جواب دیا ''بھئی تکلف کی ضرورت نہیں اب بہت دیر ہوگئی ہے اور مجھے ماڈل ٹاؤن پہنچنا ہے وہاں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔''

''نہیں تم ماڈل ٹاؤن نہیں جاؤ گے میں تمہارے لیے چارپائی اور بستر کا انتظام کرتا ہوں تم رات یہیں رہو!''

''لیکن ابا جان پریشان ہوں گے ہمیں کل دوپہر کو واپس جانا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ علی الصباح تمہارے پاس آجاؤں گا۔''

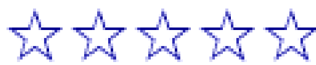
''بھئی نہیں، اگر تمہارے ابا جان کو یہ معلوم ہے کہ تم میرے پاس آئے ہو تو وہ یہ سمجھ جائیں گے کہ میں نے تمہیں روک لیا ہے۔ صبح میں تمہارے ساتھ جا کر معذرت کرلوں گا۔''

''بھئی یہ تو ابا جان بھی کہتے تھے کہ میں نہیں آسکوں گا۔''

ہوسٹل کے نوکر نے کمرے کے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا ''سلیم صاحب! کھانا لے آؤں؟''

''ہاں بھئی، دو آدمیوں کا کھانا لے آؤ''

نوکر چلا گیا اور سلیم نے ارشد کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''ارشد! میں ایک دوست کی مزاج پرسی کر آؤں۔ پانچ منٹ میں آتا ہوں اس کے بعد اطمینان سے باتیں کریں گے۔''



کھانا کھانے کے بعد سلیم اور ارشد بستروں پر لیٹے ایک دوسرے کو اپنی اپنی سرگزشت سنا رہے تھے۔ ارشد سے اچانک ملاقات پر سلیم کے ذہن میں جو سب سے اہم سوال تھا، وہ ابھی تک اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ یہ اس کے دل کی وہ مقدس دھڑکنیں تھیں جنہیں اس کے ہونٹوں تک آنا گوارا نہ تھا۔

اچانک ارشد نے کہا ''سلیم! بڑے دنوں کی چھٹیوں میں تم امرتسر ضرور آؤ اگر میں اپنے گاؤں گیا تو تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ امی نے بھی تاکید کی ہے کہ تم ضرور آؤ!''

سلیم نے کہا ''بھئی! یہ آج پتہ چلا کہ تم گاؤں کے رہنے والے ہو تم تو کہا کرتے تھے کہ مجھے گاؤں کی زندگی دیکھنے کا بہت کم اتفاق ہوا ہے۔''

ارشد نے جواب دیا ''ہاں بھئی ہوش سنبھالنے کے بعد میں نے پہلی بار اس وقت اپنا گاؤں دیکھا تھا جب میں میٹرک کا امتحان دے چکا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہاں ہماری تھوڑی سی زمین تھی جس کا بیشتر حصہ دادا مرحوم نے اپنی زندگی میں گروی رکھ دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ابا جان نے اپنی تعلیم کے اخراجات پورا کرنے کے لیے باقی کھیت بھی گروی رکھ دیے۔ ملازم ہونے کے بعد مکان انہوں نے اپنے چچا زاد بھائیوں کے حوالے کر دیا۔ اور وہاں سے یہ عہد کر کے نکلے کہ وہ گاؤں میں اس وقت تک آباد نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنی زمین نہیں چھڑا لیتے۔ اب ابا جان نے نہ صرف وہ زمین چھڑا لی ہے بلکہ کچھ اور خرید لی ہے، گاؤں سے باہر ہم نے ایک چھوٹی سی کوٹھی بھی بنوا لی ہے سلیم تم ضرور آؤ عصمت اور راحت بھی تمہیں بہت یاد کرتی

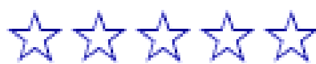
ہیں۔ عصمت ابھی تک اپنی سہیلیوں کو تمہاری کہانیاں سنایا کرتی ہے۔‘‘

’’وہ کون سی جماعت میں پڑھتی ہیں؟‘‘ سلیم نے جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

’’عصمت دسویں میں ہے اور راحت ساتویں میں‘‘

سلیم دو ننھے اور معصوم چہروں پر زمانے کی تبدیلیوں کا تصور کرنے لگا اور ماضی کے دلفریب نقوش اسے موہوم تصویریں نظر آنے لگے۔ وہ بچپن کے بے اختیار قہقہوں کو جوانی کی سنجیدہ مسکراہٹوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا وہ سوچ رہا تھا عصمت اب بڑی ہو گئی ہے رواج کے ہاتھ اس کے چہرے پر نقاب ڈال چکے ہوں گے اب وہ اس کے لیے پھولوں کے گلدستے نہیں بنا سکے گا۔ اب وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ نہیں کہہ سکے گا ’’دیکھو! اسے گرا نہ دینا‘‘ وہ ان دنوں، مہینوں اور برسوں سے خفا تھا جو اس کی شاہراہ حیات کے ہر رنگین اور دلکش نقش کو اپنی آغوش میں چھپا رہے تھے۔

ارشد سو گیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد سلیم کو بھی نیند آ گئی خواب میں وہ ماضی کی دیواریں پھاندتا ہوا اس رنگین وادی میں جا پہنچا جہاں بچپن اچھلتا کودتا اور قہقہے لگاتا ہے۔



بڑے دنوں کی چھٹیوں میں سلیم کو سیدھا اپنے گاؤں جانے کی بجائے امرتسر

اترنا پڑا۔ ارشد گزشتہ ملاقات میں اسے بتا چکا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے نوکری سے مستعفی ہو کر اپنی دکان کھول لی ہے وہ امرتسر میں اپنے مکان کا پتہ بھی اس کے پاس چھوڑ آیا تھا۔

دوپہر کے وقت دکان بند تھی، اس لیے سلیم نے تانگے والے کو مکان کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ تانگے والے کو ڈاکٹر شوکت کا مکان تلاش کرنے میں دیر نہ لگی۔ اس نے محلے میں داخل ہو کر جس دکاندار سے مکان کا پتہ پوچھا وہ خود ہی ساتھ آ کر اسے مکان کے دروازے پر چھوڑ گیا۔ سلیم نے تانگے سے اپنا سوٹ کیس اتار کر دروازے کے سامنے رکھ دیا۔ اور تانگے والے کو کرایہ ادا کرنے کے بعد دروازے پر دستک دی۔ ایک لڑکے نے باہر جھانکتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں'' اور پیشتر اس کے کہ سلیم کچھ کہتا، اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

سلیم نے قدرے تذبذب کے بعد پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسی لڑکے نے پھر ایک بار کواڑ کھول کر اپنا سر باہر نکالتے ہوئے کہا ''میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر نہیں ہیں'' وہ دوبارہ دروازہ بند کرنے کو تھا کہ سلیم نے جلدی سے کہا'' ارے امجد! تم مہمانوں کے ساتھ اسی طرح پیش آیا کرتے ہو؟ ارشد کہاں ہے؟''

''بھائی جان باہر گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔ آپ کہاں سے آئے ہیں؟''

کسی نے امجد کا کان پکڑ کر ایک طرف ہٹاتے ہوئے باہر جھانکا اور کہا'' آپ لاہور سے آئے ہیں؟''

’’جی ہاں!‘‘سلیم نے راحت کو پہچانتے ہوئے جواب دیا

راحت کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا اور وہ امی جان! آپا جان! کہتی ہوئی واپس بھاگ گئی۔

ماں کی آواز آئی ’’اری کیا ہے؟‘‘

’’امی جان وہ آ گئے ہیں؟‘‘

’’کون سلیم؟‘‘

’’ہاں وہ آ گئے ہیں‘‘

عصمت کتاب پھینک کر اپنے کمرے سے نکلی اور دروازے کے ساتھ لگ کر باہر جھانکنے لگی اچانک سلیم نے اس کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔عصمت جلدی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ماں نے کہا ’’راحت تم بیٹھک کا دروازہ کھول کر بھائی کو اندر بٹھاؤ، آج خدا جانے نوکر کہاں غارت ہو گیا ہے۔‘‘

راحت نے امجد سے کہا ’’امجد تم جاؤ انہیں بیٹھک میں لے آؤ میں دروازہ کھولتی ہوں‘‘

امجد نے جواب دیا ’’بس میں نہیں مانتا تمہارا کہنا تم نے میرا کان کیوں کھینچا تھا۔‘‘

’’تھپڑ لگاؤ اس کے منہ پر‘‘ ماں نے بگڑ کر کہا

’’بڑا کمینہ ہے یہ‘‘ عصمت نے آگے بڑھ کر کہا

امجد ایسے مہمان کی آمد پر قطعاً خوش نہ تھا جس نے آن کی آن میں گھر کی فضا بدل دی تھی تاہم اسے مجبوری سمجھتے ہوئے وہ مکان سے باہر نکل آیا اور سلیم سے مخاطب ہو کر بولا ''آؤ جی بیٹھک میں!''

اتنی دیر میں راحت بیٹھک کا دروازہ کھول چکی تھی سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اندر داخل ہوا۔۔۔۔راحت تذبذب کی حالت میں کھڑی تھی کہ اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی سلیم نے سلام کیا۔

وہ بولی ''بیٹا جیتے رہو ابھی تھوڑی دیر ہوئی ہم تمہارے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ارشد ابھی باہر گیا ہے۔۔۔۔بیٹھ جاؤ بیٹا! راحت! تم نے بھائی کو سلام نہیں کیا!'' اور وہ ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ ''بھائی جان السلام علیکم'' کہہ کر ساتھ والے کمرے میں غائب ہوگئی۔ عصمت دروازے کی اوٹ میں کھڑی تھی۔راحت نے اس کی طرف دیکھ کر دبی زبان میں کہا ''آپا جان! اب تو وہ بہت بڑے ہو گئے ہیں۔''

''چڑیل چپ رہو!'' عصمت اسے بازو سے پکڑ کر دروازے سے دور لے گئی۔

بیٹھک میں ان کی ماں سلیم سے کہہ رہی تھی ''بیٹا تم آرام سے بیٹھو، ارشد ابھی آ جائے گا۔ میں تمہارے لیے چائے تیار کراتی ہوں۔امجد! تم اپنے بھائی کے پاس بیٹھو!''

وہ چلی گئی تو سلیم امجد کی طرف متوجہ ہوا امجد ادھر آؤ!'' امجد جھجکتا ہوا آگے بڑھا۔ سلیم نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا۔امجد پڑوس میں اپنے ایک

ہم جماعت کے گھر جا کر پتنگ اڑانا چاہتا تھا اور وہ اس خیال سے پریشان تھا کہ جب تک ارشد نہیں آئے گا، اسے چھٹی نہیں ملے گی لیکن سلیم بچوں کو بہلانا جانتا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔"

سلیم نے پوچھا "امجد! تم اپنے گاؤں کب جا رہے ہو؟"

"ہم کل جائیں گے آپ بھی گاؤں کے رہنے والے ہیں نا؟"

"ہاں! تم میرا گاؤں دیکھ چکے ہو لیکن تم اس وقت بہت چھوٹے تھے"

"بھلا گاؤں میں سانپ ہوتے ہیں؟"

"ہوتے ہیں"

"بہت بڑے بڑے سانپ جو آدمی کو سالم نگل جاتے ہیں؟"

"نہیں ایسے سانپ نہیں ہوتے یہ تمہیں کس نے بتایا؟"

"راحت نے وہ کہتی تھی کہ سانپ جب پھنکارتے ہیں تو آگ نکلتی ہے اور اگر انہیں ڈنڈا مارا جائے تو ڈنڈے کو آگ لگ جاتی ہے وہ یہ بھی کہتی ہے کہ گاؤں میں ریچھ، شیر اور چیتے ہیں۔"

"وہ تم سے مذاق کرتی ہوگی۔"

"مجھے معلوم ہے، وہ مذاق کرتی ہے۔ یہ جانور جنگلوں میں ہوتے ہیں لیکن بھوت اور جن گاؤں میں ضرور ہوتے ہوں گے اور رات کے وقت وہ لوگوں کو ڈراتے بھی ہوں گے؟"

"نہیں، اگر انسان کو ڈرپوک نہ ہو تو اسے کوئی نہیں ڈراتا"

’’آپ کو بھی نہیں ڈرایا کسی نے؟‘‘

’’نہیں‘‘

’’راحت کہتی ہے کہ بھوت بڑا خطرناک ہوتا ہے وہ بچوں کو چمٹ جاتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ اسے ٹھنڈے پانی میں غوطے نہ دیے جائیں بعض بھوت بہت ضدی ہوتے ہیں اور ان سے جان چھڑانے کے لیے منہ کو سیاہی لگا کر گدھے پر سواری کرنی پڑتی ہے۔ بھلا یہ سچ ہے؟‘‘

سلیم بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہا تھا اور راحت دوسرے کمرے میں دروازے کے ساتھ کھڑی اپنی دانت پیس رہی تھی۔

’’یہ سب جھوٹ ہے نا؟‘‘

سلیم نے کہا ’’تمھیں یہ سب باتیں راحت نے بتائی ہیں؟‘‘

’’ہاں جی وہ بہت جھوٹ بولتی ہے وہ کہتی تھی گاؤں میں جب بارش ہوتی ہے تو پانی لوگوں کے گھروں تک پہنچ جاتا ہے اور جو تیرنا نہیں جانتے وہ ڈوب جاتے ہیں اس لیے مجھے گاؤں میں نہیں جانا چاہیے۔‘‘

سلیم نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ’’وہ تم سے مذاق کرتی ہے‘‘

امجد بولا ’’یہ بھی کہتی ہے کہ رات کے وقت جب گاؤں کے لوگ سو جاتے ہیں تو چوہے ان کے اوپر چڑھ کر ناچتے ہیں اور گیدڑ کھیتوں سے نکل کر‘‘ راحت نے دروازے کی اوٹ سے سر نکال کر اسے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اور وہ فقرہ پورا نہ کر سکا۔

سلیم کی توجہ امجد کی طرف تھی، اس لیے وہ راحت کو نہ دیکھ سکا۔امجد کے اچانک خاموش ہو جانے پر اس نے کہا ''ہاں بھئی! گیدڑ کیا کرتے ہیں کھیتوں سے نکل کر؟''

''بھائی جان! یہ بکواس کرتا ہے'' راحت یہ کہتے ہوئے اندر آ گئی

امجد بولا ''ہونہہ! تم نے کہی نہیں تھیں مجھ سے یہ باتیں؟''

راحت نے کہا ''بھائی جان، یہ کانگرسی ہے اس کی باتوں پر یقین نہ کیجئے یہ کٹر کانگرسی ہے۔''

راحت نے امجد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا کانگرسی کہلانا اس کے لیے ایک گالی کے مترادف تھا اور کٹر کانگرسی کہلانا اس کے نزدیک بدترین گالی تھی بالخصوص جب سے اس نے مہاتما گاندھی کی تصویر دیکھی تھی، کانگرسی بن جانے کا تصور بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔اس کے ذہن میں کانگرس اور مہاتما گاندھی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔اس نے غصے میں آ کر کہا ''مجھے کانگرسی کہو گی تو میں تمہاری ساری باتیں بتا دوں گا تم نے مجھے مینڈکوں، کچھوؤں اور نیولوں کے متعلق بھی بتایا تھا کہ وہ سردیوں کی راتوں میں بچوں کے ساتھ آ کر سو جاتے ہے۔اور بھینسے مکان کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں بھینسے کے متعلق تو بڑی آپا نے بھی کہا تھا۔۔۔''

عصمت نے دوسرے کمرے سے آواز دی ''امجد!''

اور اس نے جواب دینے کی بجائے فریاد کے لہجے میں کہا ''آپا جان! چھوٹی آپا مجھے کٹر کانگرسی کہتی ہیں''

''امجد! ادھر آؤ!'' اندر سے دوبارہ آواز آئی

امجد اٹھ کر جھجکتا ہوا آگے بڑھا لیکن راحت نے جلدی سے اس کا کان پکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی دوسرے کمرے میں لے گئی۔

سلیم ہنس رہا تھا امجد چند منٹ کے بعد دوبارہ اس کے کمرے میں آیا تو وہ کافی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ارشد آ گیا سلیم نے اس کے ساتھ چائے پی اور شام کے وقت دونوں سیر کے لیے نکل گئے رات کے وقت کھانا کھانے کے بعد سلیم، ارشد، ڈاکٹر شوکت اور ان کی بیوی کے ساتھ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ راحت اور امجد خاموشی سے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھے رہے۔ سلیم عصمت کی غیر حاضری کے باعث اس محفل میں ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔

گفتگو کا موضوع پاکستان تھا سلیم کی گرمجوشی سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم جیسے نوجوان اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرنے لگے ہے، ہندو بہت زیادہ تیار ہو چکا ہے لیکن بدقسمتی سے ہم ابھی تک اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ ہم ایک قوم ہیں اور ہمیں ایک وطن کی ضرورت ہے تم نوجوانوں کو بہت کام کرنا ہے۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ طوفان آ چکا ہوگا اور ہم ابھی تک یہ بحث کر رہے ہوں گے کہ ہمیں کسی جائے پناہ کی ضرورت ہے یا نہیں۔"

ارشد کی ماں بولی "بھئی سلیم! ارشد تمہاری تقریر کی بہت تعریف کرتا تھا اگر یہاں تمہارے پاس اس کی کوئی نقل ہے تو ہمیں بھی سنا دو"

"جی، جو تقریر میں نے کی تھی، وہ تو مجھے اسی دن بھول گئی تھی میں نے فقط مخالفین

کے اعتراضات کا جواب دینے پر اکتفا کاے تھا۔"

"اچھا جو لکھی تھی، وہ سنا دو!"

سلیم نے اپنا سوٹ کیس کھول کر چند کاغذ نکالے اور انہیں پڑھ کر سنانے لگا ڈاکٹر صاحب نے اسے کئی بار "خوب اور بہت خوب" کہہ کر داد دی اور اختتام پر کہا "بھئی خدا تمہیں ہمت دے تم پاکستان کے لیے بہت کام کر سکو گے!"

ارشد کی ماں بولی "بیٹا! جب تم عصمت اور راحت کو عجیب و غریب کہانیاں سنایا کرتے تھے میں اسی وقت کہا کرتی تھی کہ خدا نے تمہیں بہت اچھا ذہن دیا ہے۔"

راحت نے آہستہ سے امجد کے کان میں کچھ کہا اور وہ بلبلا اٹھا "ابا جان راحت مجھے پھر کانگرسی کہتی ہے۔"

راحت کو ماں نے ڈانٹا اور وہ رنجیدہ ہونے کی بجائے ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

راحت اور امجد کے جھگڑے گھر کی زندگی کا ایک لازمی جزو بن چکے تھے۔ راحت اسے چھیڑتی وہ ماں یا باپ کے پاس جا کر فریاد کرتا۔ کبھی کبھی راحت کو ڈانٹ پڑتی اور وہ تھوڑی دیر کے لیے امجد کے ساتھ بول چال بند کر دیتی۔ پھر امجد کی باری آتی۔ وہ دوسروں سے نظر بچا کر اس کا منہ چڑاتا۔ جب اس پر بھی وہ متوجہ نہ ہوتی تو وہ اس کے ہاتھ سے کتاب، قلم یا سویٹر بننے کی سلائیاں چھین کر ہنستا ہوا بھاگ جاتا۔ راحت اس کا پیچھا کرتی کبھی کبھی امجد جان بوجھ کر اس کے ہاتھ آ جاتا اور راحت اسے پیٹنا چاہتی لیکن وہ ہاتھ جو غصے سے بلند ہوتے، امجد کے حسین گالوں

تک پہنچتے پہنچتے رک جاتے ’’پھر کرو گے شرارت؟‘‘ وہ اس کا کان پکڑ کر کہتی۔

’’نہیں! نہیں! آپا جان معاف کردو‘‘ وہ ہنستے ہوئے کہتا اور آپا جان بھی اپنا غصہ بھول کر ہنس پڑتیں اور اگر کبھی راحت کچھ دیر کے لیے سچ مچ خفا ہو جاتی تو امجد محسوس کرتا کہ گھر کی فضا پر اداسی چھا رہی ہے۔

آج بھی جب راحت اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تو تھوڑی دیر کے بعد امجد کو سلیم، ارشد اور اپنے والدین کی محفل میں تنہائی کا احساس ہونے لگا کچھ دیر اس نے اپنے دل پر جبر کیا۔ بالآخر وہ اٹھا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا راحت جو عصمت کے پاس بیٹھی اس سے کھسر پھسر کر رہی تھی، دبی زبان میں بولی ’’آپا یہ کانگرسی میرا پیچھا نہیں چھوڑتا‘‘

☆☆☆☆☆

رات کے وقت یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ سلیم، ارشد کی والدہ اور بچوں کے ساتھ ان کے گاؤں جائے گا اور وہ تین دن وہاں رہے گا۔

چنانچہ صبح دس بجے کے قریب وہ ان کے ساتھ امرتسر سے اجنالہ کی طرف جانے والی موٹر پر سوار ہو گیا۔ ڈاکٹر شوکت اپنی مصروفیات کے باعث ان کا ساتھ نہ دے سکے۔

اجنالہ سے چند میل آگے ارشد نے ڈرائیور کو لاری کھڑی کرنے کے لیے کہا گاؤں کے چار آدمی جنہیں ڈاکٹر شوکت کے چچا زاد بھائی نے سامان اٹھانے کے

لیے بھیجا تھا، سڑک پر کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ارشد نے سامان ان کے حوالے کیا اور یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل گاؤں کی طرف چل دیے۔

ارشد کی والدہ اور عصمت سیاہ برقعے پہنے ہوئے تھیں اور راحت نے موٹر سے اترنے کے بعد برقعہ اتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔

ارشد سلیم سے کہہ رہا تھا "یہ راحت بڑی چڑیل ہے پچھلے دنوں اسے خیال آیا کہ برقع پہننے سے چھوٹی لڑکیاں بھی معتبر بن جاتی ہیں چنانچہ اس نے ہمیں برقع سلوانے پر مجبور کرنے کے لیے بھوک ہڑتال کر دی۔ اب اس کی جان عذاب میں ہے۔ اگر ایک دن برقع پہن لیتی ہے تو دو دن دوپٹے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتی ابھی ہم گاؤں پہنچیں گے تو وہاں کے بچوں پر رعب ڈالنے کے لیے فوراً برقع پہن لے گی۔"

کوئی دو میل پگڈنڈی پر چلنے کے بعد ارشد نے سامنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "سلیم! وہ ہمارا گاؤں ہے اور وہ آم کے درخت کے ساتھ ہمارا نیا مکان ہے وہ درخت بہت پرانا ہے، میرے دادا نے لگایا تھا۔"

سلیم دو دن وہاں رہا اس عرصہ میں راحت اور امجد اس کے ساتھ کافی مانوس ہو چکے تھے رات کو کھانا کھانے کے بعد سلیم کافی دیر ارشد، راحت، امجد اور ان کی والدہ سے باتیں کرتا رہتا۔ گزشتہ چند سال کے عرصے میں اس کے گاؤں میں کئی ایسے واقعات پیش آ چکے تھے جو سننے والوں کے لیے بیحد دلچسپ تھے۔ چچا اسماعیل گاؤں کی زندگی میں نئے قہقہوں اور نئی مسکراہٹوں کا اضافہ کر چکا تھا۔۔۔ چودھری

رمضان سے کئی اور بدحواسیاں سرزد ہو چکی تھیں کالو عیسائی اور ہری سنگھ لوہار کی لفظی جنگ کئی نئے مراحل طے کر چکی تھی سلیم انہیں یہ واقعات سناتا اور کبھی کبھی اسے ان کے علاوہ ساتھ والے کمرے سے کسی کے دبے دبے میٹھے اور دلفریب قہقہوں کی آواز بھی آتی اور اسے اس دیوار کا احساس ہونے لگتا جو وقت نے اس کے اور عصمت کے درمیان حائل کر دی تھی۔

دوسری رات وہ انہیں ایک ادبی رسالے سے اپنا مضمون 'میرا گاؤں' پڑھ کر سنا رہا تھا۔ اس کی کرسی کمرے کے ایک کونے میں میز کے قریب تھی جس پر لمپ جل رہا تھا۔ ارشد اس کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور کمرے کے دوسرے سرے پر ایک چارپائی پر ارشد کی والدہ، امجد اور راحت بیٹھی ہوئی تھیں عصمت ساتھ والے کمرے کے دروازے میں کھڑی تھی۔ ماں نے اسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور وہ سفید چادر میں لپٹی ہوئی دبے پاؤں آگے بڑھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی سلیم کو اس کمرے میں اس وقت اس کی موجودگی کا احساس ہوا جب کسی واقعہ پر وہ ہنس رہے تھے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز ساتھ والے کمرے کی بجائے اب اس کمرے کے کونے سے آرہی تھی۔

اچانک امجد چلایا "امی جان! اب بڑی آپا بھی مجھے کانگرسی کہتی ہیں" اس پر سب ہنس پڑے اور عصمت اپنا سارا وجود سمیٹ کر ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد عصمت راحت کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی اور امجد چوکنا ہو کر سننے کی کوشش کر رہا تھا عصمت نے غصے کی حالت میں اسے گردن سے پکڑ کر پرے

دھکیلتے ہوئے کہا ''کانگرسی پیچھے ہٹو!''

امجد اپنے مطلب کی کوئی بات تو نہ سن سکا تاہم ایسے یقین ہو چکا تھا کہ یہ کانا پھوسی اس کے سوا کسی اور کے متعلق نہیں چنانچہ وہ اپنی مدافعت کے لیے تیار ہو کر بیٹھ گیا۔

راحت نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''بھائی جان! اس پیر کا واقعہ سنایئے جو آپ کا گھوڑا خرید نے آیا تھا۔''

امجد گھوڑا خرید نے والے پیر کے ساتھ اپنا کوئی تعلق قائم نہ کر سکا تاہم اس نے سلیم کو ایک بات سے باخبر کرنا ضروری سمجھا۔ وہ بولا ''بھائی جان! یہ بات بڑی آپا نے چھوٹی آپا کے کان میں کہی ہے۔ میں سن رہا تھا۔''

ماں نے ڈانٹا ''تم بہت شریر ہو گئے ہو''

امجد اب محسوس کر رہا تھا کہ ہر معاملے میں صاف گوئی سودمند ثابت نہیں ہوتی۔۔۔۔ ماں اسے گھور رہی تھی راحت اس کی پنڈلیوں میں اپنے ناخن چبھونے کی کوشش کر رہی تھی اور عصمت نظر بچا کر اس کے کان مروڑ رہی تھی۔ وہ زہر کے گھونٹ پی کر اٹھا اور کمرے کے دوسرے کونے میں سلیم کے پیچھے کرسی پر جا بیٹھا۔

سلیم نے پیر ولایت شاہ کی سرگزشت کے ساتھ رمضان کے کوٹھے پر چڑھنے والے بھینسے کا قصہ بھی سنا دیا۔ اختتام پر جب سب قہقہے لگا رہے تھے، امجد ہنستے ہنستے اچانک سنجیدہ ہو گیا اور ارشد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ''بھائی جان! ہم اپنے مکان کے پچھواڑے کسی کو پیال کا ڈھیر نہیں لگانے دینگے۔''

ارشد نے سلیم سے کہا ''بھئی جب ہم تمہارے گاؤں گئے تھے،تو اس گھوڑے کی تصویر تمہاری بیٹھک میں لگی ہوئی تھی، مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ وہ مر چکا ہے۔''

ارشد کی ماں نے پوچھا ''بیٹا کیسے مرا وہ؟''

''یوسف میری غیر حاضری میں اسے گھر والوں سے چوری چنے کھلا دیا کرتا تھا، اس کا خیال تھا کہ میری غیر حاضری میں اسے پوری غذا نہیں ملتی۔ ایک دن اس نے اس کے آگے بہت زیادہ چنے ڈال دیے۔۔۔۔گھر والوں کو اس کے مرنے کے بعد یہ پتہ چلا کہ وہ یوسف کی محبت کا شکار ہوا ہے۔''

امجد نے برہم ہوکر کہا ''یوسف کون ہے؟''

''وہ میرا چھوٹا بھائی ہے،وہ تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا،تم اسے بھول گئے؟''

امجد نے کہا ''جب آپ کو پتہ چل گیا کہ گھوڑے کے آگے اس نے زیادہ چنے ڈال دیے تھےتو آپ نے اسے کچھ نہ کہا؟''

''بھئی اسے کیا معلوم تھا کہ زیادہ چنے کھانے سے گھوڑا مر جائے گا۔''

امجد کو اچانک اپنی مظلومیت کا احساس ہوا اور اس نے کہا ''دیکھو جی! ایک دن میں نے بھائی جان کی میز سے دوات گرا دی تو انہوں نے مجھے دو تین تھپڑ لگا دیے۔ ایک دن مجھ سے بڑی آپا کا قلم ٹوٹ گیا تو انہوں نے بھی مجھے پیٹا تھا۔''

ارشد ہنستے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی گود میں بٹھالیا اور کہا ''سلیم بھائی! یہ بڑا خطرناک آدمی ہے!''

راحت بولی ''بھائی جان! سب کانگرسی خطرناک ہوتے ہیں'' اور امجد دانت پیس کر رہ گیا۔

ماں بولی ''خبردار! میرے بیٹے کو کسی نے کانگرسی کہا تو۔۔۔۔۔!''



اگلے دن سلیم نے اپنے میز بانوں کو خدا حافظ کہا۔ ارشد سڑک تک اس کے ساتھ آیا اور اسے موٹر پر بٹھا کر واپس چلا گیا۔ شام کے پانچ بجے سلیم اپنا سوٹ کیس اٹھائے اس پگڈنڈی پر جا رہا تھا جس کے ہر موڑ اور ہر کھیت کی تصویر اس کے دل پر نقش تھی لیکن اس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ ایک نئے راستے کے نقوش اس کے دل میں ابھر رہے تھے گاؤں کے قریب پہنچ کر اسے بڑ کا وہ درخت نظر آنے لگا جو اس کے مکان کے سامنے تھا اور اس کا تصور آم کے اس درخت تک جا پہنچا جس کی شاخیں ارشد کے مکان پر پھیلی ہوئی تھیں وہ سوچ رہا تھا کاش! یہ درخت اس قدر قریب ہوتے کہ ان کی شاخیں ایک دوسرے سے مل جاتیں۔ کاش وہ مکان اس قدر پاس ہوتا کہ وہ کسی کے شرمائے ہوئے دبے دبے قہقہوں کو سن سکتا۔ سلیم کے ذہن میں ماضی کے خیالات کی منتشر کڑیاں ایک زنجیر میں تبدیل ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے دل میں نئی امنگیں اور نئے ولولے محسوس کر رہا تھا۔ اس کے شعور و احساس میں ایک گہرائی آ چکی تھی۔

مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، اس نے گاؤں سے باہر رہٹ کے پانی سے

وضو کیا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا نماز پڑھنے کے بعد جب وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہا تھا تو اس کی دعا میں چند نئے الفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ دعا ختم کر کے اٹھنے والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کر لیں اور وہ ہاتھوں اور کلائیوں کو ٹٹولتے ہی چلا اٹھا ''کون مجید؟''

مجید ہنس پڑا اور وہ اٹھ کر اس کے گلے لپٹ گیا مجید کے ساتھ ایک اور قوی ہیکل نوجوان کھڑا تھا۔ سلیم نے اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور جواب طلب نگاہوں سے مجید کی طرف دیکھنے لگا مجید بولا ''بھلا بتاؤ تو یہ کون ہے؟''

سلیم نے غور سے اس کی طرف دیکھا، اچانک ماضی کے چند دھندلے نقوش اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے ''ارے داؤد!'' وہ چلایا

مجید نے ہنستے ہوئے کہا ''داؤد نکالو ایک روپیہ! دیکھو سلیم! یہ مجھ سے شرط لگاتا تھا کہ تم اسے نہیں پہچان سکو گے۔''

سلیم بولا ''بھئی مجھے پہچاننے میں کچھ تکلیف ضرور ہوئی اب اس نے استرے سے سر منڈانے کی بجائے بال رکھ لیے ہیں بھئی داؤد! کب آئے؟''

اس نے جواب دیا ''مجھے کوئی آٹھ دن ہو گئے ہیں آج پتہ چلا کہ چودھری مجید آئے ہوئے ہیں، اس لیے یہاں چلا آیا۔ اب واپس جا رہا تھا کہ آپ مل گئے۔''

''بس اب تم یہیں ٹھہرو گے!''

مجید بولا ''ہاں بھئی، اب تم نہیں جا سکتے''

رات کے وقت مجید اور داؤد اپنی فوجی زندگی کے کارنامے سنا رہے

تھے۔۔۔۔۔۔۔مجید اب جمعدار ہو چکا تھا اور داؤد ابھی تک سپاہی تھا۔

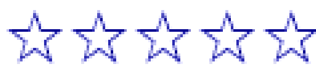
☆☆☆☆☆

جنگ کے اختتام کے بعد برطانیہ کی وزارت ہندوستان کو آزادی کے اس درخت کا پھل تقسیم کرنے والی تھی جسے جرمنی اور جاپان کی گرم ہواؤں سے بچانے کے لیے غلام اقوام سے خون اور پسینے کی بھیک مانگی گئی تھی۔ انگریز بظاہر ہندوستان کی سیاسی جنگ میں ایک فریق کی بجائے ثالث کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ کانگرس جس نے 1942ء میں جاپان کی سنگینوں کے سائے میں ہندو سامراج کے احیاء کے امکانات دیکھ کر ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ لگایا تھا، اب مایوسی کی حالت میں ٹوکیو کی بجائے لندن کو اپنی توقعات کا مرکز بنا چکی تھی۔

انگریز بہر حال جا رہا تھا کب جا رہا تھا؟ کن حالات میں جا رہا تھا؟ کانگرس کو اس کے متعلق کوئی پریشانی نہ تھی اس کے سامنے فقط ایک نصب العین تھا اور وہ یہ کہ گورا سامراج جن اختیارات سے دستبردار ہو، وہ کالے فاشزم کے ہاتھ آ جائیں انگریزی اقتدار کے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور کانگرس چاہتی تھی کہ اس کی ٹمٹماتی لو سے ہندو اقتدار کی مشعل روشن کر لی جائے ''شیر برطانیہ'' بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے دانت جھڑ چکے تھے اور وہ ہندوستان کی وسیع شکار گاہ کو چھوڑنے والا تھا اور بھارت کے بھیڑیوں کے منہ سے رال ٹپک رہی تھی وہ کہہ رہے تھے ''ان داتا! تم جا رہے ہو تو یہ شکار گاہ ہمارے سپرد کر جاؤ۔ دیکھو ہماری اکثریت ہے تمہیں ان بھیڑوں

کے متعلق پریشان ہونے کی ضرورت نہیں جو پاکستان کی چراگاہ کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ ہماری ہیں ہم ان کی رکھوالی کریں یا شکار کھیلیں، تمہیں اس کے متعلق پریشان ہونے کا حق نہیں۔"

ہندو کے سامنے صرف ایک محاذ تھا اور اس محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے وہ اپنی ساری قوتیں بروئے کار لا چکا تھا، اور یہ محاذ مسلمانوں کے خلاف تھا۔ کانگرس ایک طرف ان جنونیوں کی افواج تیار کر رہی تھی جنہوں نے تاریخ انسانیت میں ظلم، وحشت اور بربریت کے ایک نئے باب کا اضافہ کرنا تھا اور دوسری طرف انگریز کے ساتھ اس کی منطق یہ تھی کہ مسلمان ہمارے بھائی ہیں، اس لیے آزاد ہندوستان میں جو ہمارے حصے آتا ہے، وہ ہمیں دے دو جو مسلمان کے حصے آتا ہے، وہ بھی ہمیں دے دو۔ اور صرف یہی نہیں تم جانے سے پہلے ہمیں اقتدار کے گھوڑے پر سوار کر دو۔ ہمارے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول دے دو اور مسلمانوں کو رسیوں میں جکڑ کر ہمارے سامنے ڈال دو۔ پھر تم اطمینان سے چلو جاؤ۔ پھر کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔۔۔۔ کوئی فساد نہیں ہوگا۔ اس ملک میں شانتی ہی شانتی ہوگی۔۔۔۔۔ اگر تم نے پاکستان کے نعروں کی طرف توجہ دی تو ہم یہ کہیں گے کہ تم فرقہ وارانہ فساد کی بنیاد رکھ کر جا رہے ہو۔ ہم ہندوستان کی مقدس گائے کے دو ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے۔



دوڑ شروع ہو چکی تھی مسلمان پاکستان کو اپنا آخری حصار سمجھ کر طوفان سے پہلے

وہاں پہنچنا چاہتا تھا اور ہندو فاشزم پاکستان کو اپنے جارحانہ مقاصد کے سامنے سد سکندری سمجھ کر اس کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہندو فاشزم اپنی پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا لیکن مسلمانوں کے راستے میں کئی رکاوٹیں تھیں۔ ان کے راستے میں وہ نام نہاد نیشنلسٹ مسلمان کانٹے بچھا رہے تھے جو ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض ہندو کے ساتھ قوم کی عزت اور آزادی کا سودا کر چکے تھے۔ ان کے راستے میں وہ یونینسٹ مسلمان گڑھے کھود رہے تھے جن کے اسلاف نے کبھی سکھوں اور کبھی انگریزوں سے اپنی قوم کے شہیدوں کے خون کی قیمت وصول کی تھی۔ یہ ابن الوقت انگریزی راج کے خاتمہ کے آثار دیکھ کر ہندو فسطانیت کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے۔ پنجاب کو یہ اپنے باپ دادا کی میراث سمجھتے تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا اور یہ کہ ان کے اقتدار کا طرہ بلند رہے۔ خواہ یہ مقصد انگریز کے بوٹ چاٹنے سے حاصل ہو، خواہ ہندو کی قدم بوسی سے۔

کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندو عملی تیاریوں میں مصروف تھے مسلمانوں کا شیرازہ منتشر رکھنے کے لیے ملت فروشوں کے گروہ کئی ناموں اور کئی چولوں کے ساتھ میدان میں آچکے تھے اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے:

کانگرس نے ایک مسلمان کو "راشٹر پتی" کے لقب سے سرفراز کر دیا ہے اس لیے مسلمانوں کو پاکستان کی ضرورت نہیں۔

پنجاب میں فلاں مولوی فلاں پروفیسر نے اپنے تازہ بیان میں کہا

ہے کہ مسلم عوام پاکستان نہیں چاہتے لہٰذا پاکستان محض ایک نعرہ ہے۔

سندھ میں فلاں سید اور فلاں حاجی پاکستان کو مسلمانوں کے لیے مضرت رساں خیال کرتا ہے لہٰذا سمجھ دار مسلمان پاکستان کے مخالف ہو گئے ہیں۔

بلوچستان میں ایک شخص نے قراقلی اتار کر گاندھی ٹوپی پہن لی ہے اس لیے پاکستان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صوبہ سرحد کے فلاں خان صاحب نے گاندھی جی پرارتھنا سبھا سے اٹھنے کے بعد یہ بیان دیا کہ گاندھی جی بہت اچھے آدمی ہیں بکری کا دودھ پیتے ہیں مرن برت رکھتے ہیں اور چرخہ کاتتے ہیں، لہٰذا مسلمانوں کی نجات پاکستان بنانے میں نہیں چرخہ کاتنے میں ہے۔

مسلمان بدحواس تھے پریشان تھے ان کے کندھوں پر لولے لنگڑے اور سیاسی بصیرت سے کورے رہنماؤں کی لاشیں تھیں۔ ان پر منافقوں اور ملت فروشوں کی شخصیتوں کے بھوت سوار تھے۔ یہ راہنما مختلف راستوں سے اپنے اپنے گروہ کو اس سیاسی قبرستان کی طرف ہانک رہے تھے۔ جہاں کانگرس ان کے کفن دفن کے انتظامات مکمل کر چکی تھی۔

ان مایوسیوں میں ایک آواز ڈگمگاتے، اونگھتے اور لڑکھڑاتے ہوئے مسلمانوں کے لیے صور اسرافیل کا کام دے رہی تھی۔ ایک دبلا پتلا اور عمر رسیدہ رہنما انہیں منزل کا راستہ دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی اپنے نحیف اور لاغر ہاتھوں سے قوم کے سفینے کے

پھٹے ہوئے بادبانوں کی مرمت کرتا اور کبھی دشمن کے چہرے سے مکر دریا کے نقاب نوچتا۔اس کی گرجتی ہوئی آواز سننے والوں کی رگوں میں بجلی کی لہر بن کر دوڑ جاتی ۔وہ کانٹوں کو روندتا ہوا اور مخالفت کی چٹانوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ تھا۔



1945ء میں کانگرس کا رویہ جس قدر مسلم لیگ کے ساتھ غیر مصالحانہ تھا اسی قدر وہ انگریز کی طرف جھک رہی تھی جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب انگریز کو شمالی ہند سے سپاہی بھرتی کرنے کی ضرورت نہ تھی۔اب ان جری نوجوانوں کی کوئی قدر نہ تھی جنھوں نے جرمنی اور جاپان کا سیلاب روکنے کے لیے اپنے فراخ سینوں پر گولیاں کھائی تھیں۔اب برطانیہ کے تجارتی مقاصد کو بڑی بڑی توندوں والے مہاجنوں کے تعاون کی ضرورت تھی۔مشرق کے ممالک میں امریکہ کے تاجروں کی اجارہ داری کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے برطانوی کارخانہ دار کانگرس کے ٹاٹاؤں، برلوں اور ڈالمیوں سے گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔کانگرس کے سرمایہ دار سرپرستوں کے گروہ کا لیڈر سیٹھ برلا برطانیہ میں اپنی تجارتی مہم کے لیے گاندھی کی اشیرباد حاصل کر کے اس حقیقت کی طرف ایک غیر مبہم اشارہ کر چکا تھا کہ انگریز اور کانگرس کے سیاسی سمجھوتے میں اور برطانوی تاجر اور ہندو مہاجن کی سودا بازی کو ایک لازمی شرط قرار دیا جائے گا۔

مرکز میں عبوری دور کے لیے ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کے سلسلہ میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ کانگرس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ماننے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ مرکز میں ہندو اور مسلم نمائندوں کی برابری کے اصول کی مخالف تھی۔ اس کے علاوہ وہ مسلمانوں کے حصے میں سے بھی کم از کم ایک نیشنلسٹ مسلمان کو نامزد کرنے کا حق تسلیم کروانا چاہتی تھی تاکہ بوقت ضرورت اسے واردھا کے سامراجی مقاصد کے رتھ میں جوتا جاسکے۔

بظاہر یہ نیشنلسٹ یا سیاسی یتیموں کا گروہ کانگرس اور مسلم لیگ کے سمجھوتے کی راہ میں رکاوٹ نظر آتا تھا لیکن درحقیقت یہ وہ بے جان پتھر تھے جن کی آڑ لے کر کانگرس ہندو کی فرقہ وارانہ جنگ کو غیر فرقہ دارانہ رنگ دینا چاہتی تھی۔

شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے عام انتخابات مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک اہم ترین مرحلہ تھے کانگرس کو کسی دوسری ہندو جماعت سے مقابلے کا خطرہ نہ تھا۔ وہ ہندو عوام پر یہ ثابت کر چکی تھی کہ اسلام دشمنی یا پاکستان کی مخالفت میں اس کی ذہنیت ہندو مہاسبھا کی ذہنیت سے مختلف نہیں لیکن مسلم لیگ کے سامنے کئی محاذ تھے۔ ہر صوبے میں کسی نہ کسی نام سے ملت فروشوں کی ٹولیاں موجود تھیں اور انہیں مسلم لیگ کے مقابلہ میں کامیاب کروانے کے لیے کانگرس کے مہاجن اپنی تجوریاں کھول چکے تھے۔

پنجاب میں ابن الوقت یونینسٹوں کا گروہ یہ دیکھ کر کہ اس کے سر سے انگریز کا سایہ اٹھنے والا ہے، اپنے اقتدار کا طرہ نہیے کی دھوتی کے ساتھ باندھ چکا تھا۔

بیرونی حملے کی نسبت اندرونی حملہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ اقوام کو دشمن سے زیادہ اپنے غدار تباہ کرتے ہیں اور یہاں غدار ایک نہ تھا، دو نہ تھے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تھے۔ مسلمانوں کی کوئی بستی، کوئی شہر اور کوئی مجلس ایسی نہ تھی جو ان کے وجود سے خالی ہو۔۔۔۔۔ اور آج تک کسی قوم نے ایسے غدار پیدا نہیں کیے جنھوں نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر قوم کو یہ سمجھانے کی جسارت کی ہو کہ تمھیں اپنی بقاء کے لیے آزاد وطن کی ضرورت نہیں۔ رائے عامہ کتنی کمزور کیوں نہ ہو، ملت فروشوں کو پہلوانوں کی حیثیت سے اپنے سیاسی اکھاڑے میں کودنے کی اجازت نہیں دیتی۔۔۔۔ وہ قوم کی آنکھوں کے سامنے زہر کا پیالہ بھر کر یہ نہیں کہتے کہ میں دشمن کی طرف سے تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ موت کے بعد تمھاری لاش کو کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ بلکہ وہ چھپ چھپ کر انتشار کا بیج بوتے ہیں۔

لیکن مسلمانوں میں اجتماعی شعور کے فقدان کا یہ عالم تھا کہ وہ ملت فروش جنھیں صبح و شام دشمن کے دستر خوان کی ہڈیاں چوستے دیکھا جاتا تھا، بازاروں میں دندناتے تھے، چوراہوں پر کھڑے ہو کر تقریریں کرتے تھے۔۔۔۔۔۔ ان کی جماعتیں تھیں، انجمنیں تھیں، اور وہ علی الاعلان قوم کے سامنے یہ ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے کہ اے قوم! اگر تجھے پاکستان مل گیا تو تیرا ستیاناس ہو جائیگا۔ عزت، آزادی اور خود مختاری تیرے لیے بھوک، افلاس اور قحط کا پیغام لائے گی، ہندو ناراض ہو جائے گا اور مہاتما گاندھی کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔۔۔۔ مسلمانو! یہ کیا بزدلی ہے کہ تم ہندو اکثریت کے اقتدار سے خطرہ محسوس کرتے ہو۔ دنیا کیا کہے گی

کہ تم اس قدر تنگ نظر تھے۔

مسلم اکثریت کے شمال مغربی علاقوں میں پنجاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا اور یہی وہ محاذ تھا، جہاں کامیابی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کے لیے پاکستان کی منزل مقصود کی طرف ایک قدم آگے بڑھانا ناممکن تھا

بنگال کے حالات امید افزاء تھے، وہاں کانگرس جن مسلمانوں کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتی تھی، وہ اپنا اثر و رسوخ کھو چکے تھے لیکن پنجاب میں ہندو فسطائیوں کو اپنی بندوقوں کے لیے یونینسٹوں کے کندھے کا سہارا مل چکا تھا۔ کانگرس یہ سمجھ چکی تھی کہ مسلم عوام اس کے پرانے نمک خواروں یعنی نیشنلسٹ مسلمانوں کو شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگے ہیں اس لیے پنجاب میں مسلم لیگ کو شکست دینے کے لیے انہوں نے یونینسٹوں کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا اور اپنے تمام ذرائع ان کی کامیابی کے لیے وقف کر دیے۔ یہ لوگ انتخاب کی جنگ لڑنے کے لیے انگریز پرست حکام کی مدد سے لاکھوں روپیہ جمع کر چکے تھے اور اب کانگرسی مہاجنوں کی سرپرستی کے باعث ان کی پونجی بہت زیادہ ہو چکی تھی۔

ان حالات میں مسلمان نوجوان اور بالخصوص تعلیم یافتہ طبقہ اجتماعی خطرات کے سامنے آنکھیں بند کر کے نہ بیٹھ سکا۔ وہ اپنی درس گاہیں، اسکول اور کالج چھوڑ کر طرے اور لنگوٹی کے اس ناپاک اتحاد کو شکست دینے کے لیے میدان میں آ گیا پاکستان کے حق میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی نسبت اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کا جوش وخروش کہیں زیادہ تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو کی اسلام دشمنی ان

پر زیادہ واضح تھی، اس لیے ان صوبوں کے سینکڑوں طلباء جن کی بیشتر تعداد علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتی تھی، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کے محاذوں پر پہنچ چکے تھے۔



ضلع گورداسپور کے ایک چھوٹے سے شہر میں مقامی مسلم لیگ کا انتخابی جلسہ ہو رہا تھا ایک ریٹائرڈ سکول ماسٹر صدارت کی کرسی پر رونق افروز تھا اور ایک نوجوان تقریر کر رہا تھا۔ اس جلسے کے انعقاد سے قبل شہر اور اردگرد کے دیہات میں منادی کی گئی تھی کہ ایک پیر صاحب کے صاحبزادے اس جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لا رہے ہیں اور چند مشہور لیڈر تقریریں کریں گے دیہات کے لوگ کچھ بڑے بڑے لیڈروں کو دیکھنے اور کچھ پیر صاحب کے صاحبزادے سے عقیدت کا ثبوت دینے کے لیے شہر میں جمع ہو چکے تھے جلسے کا وقت ہو چکا تھا کہ صاحبزادے کا پیغام پہنچ گیا کہ انہیں راستے میں روک لیا گیا ہے اور وہ اگلے دن پہنچ سکیں گے۔ مقررین کے متعلق کوئی اطلاع نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں۔

مقامی ذیلدار اور تھانیدار اس جلسے کے مخالف تھے۔ تحصیلدار صاحب دو دن قبل اس شہر کے اردگرد کے دیہات کے معتبرین کو بلا کر خبردار کر چکے تھے کہ حکام بالا کو علاقے میں بدامنی کا اندیشہ ہے، اس لیے لوگوں کو جلسے میں شریک ہونے سے روکا جائے۔ تھانیدار صاحب شہر کے دکاندار کو دھمکی دے چکے تھے کہ اگر اس نے مسلم

لیگ کے جلسے کے لئے لاؤڈ سپیکر دیا تو اچھا نہ ہوگا۔ ذیلدار صاحب بھی نمبرداروں کی ٹولی کے ساتھ دیہات کا چکر لگا چکے تھے کرائے کے چند مولوی علاقے میں سب سے بڑے مہاجن کی موٹر کار پر بیٹھ کر سادہ دل دیہاتیوں کو یہ بتا چکے تھے کہ پاکستان کا نعرہ ان کے لیے بہت خطرناک ہے لیکن اس گاؤں کے چند لڑکے امرتسر اور لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے اور مقامی اسکول کے طالب علموں کی ایک بھاری تعداد ان کے زیر اثر تھی۔ چنانچہ وہ ان کے منظم گروہ کے ساتھ قرب و جوار کی بستیوں میں اس جلسے کی منادی کر چکے تھے۔

جلسہ شام کے چار بجے ہونا تھا اور دیہات کے طالب علم دوپہر سے پہلے ہی اپنے اپنے گاؤں کے لوگوں کے گروہ لے کر شہر پہنچ رہے تھے۔ طالبعلموں کے ہاتھوں میں سبز جھنڈیاں تھیں اور ہر ٹولی کے آگے ایک شخص ڈھول بجاتا آ رہا تھا۔۔۔۔ یونینسٹ امیدوار نے ڈسٹرکٹ کانگرس کے صدر کو یہ اطلاع بھیج دی تھی کہ یہاں ایک عدد ہوشیار مولوی کی اشد ضرورت ہے۔

پیر صاحب کے صاحبزادے کا پیغام ملنے کے بعد منتظمین جلسہ کے سامنے یہ سوال تھا کہ اب صدارت کون کرے گا؟ ایک ضعیف العمر ریٹائرڈ اسکول ماسٹر ذیلدار تھانیدار اور حکام بالا کے عتاب سے بے پرواہ ہو کر کرسی صدارت پر بیٹھنے کے لیے تیار ہو گیا تو لیڈروں کا انتظار ہونے لگا۔۔۔۔ ساڑھے چار بج گئے حاضرین میں اضطرات پیدا ہونے لگا۔ بالآخر کالج کے ایک نوجوان نے تقریر شروع کر دی۔۔۔۔ وہ پاکستان کے حق میں ایک تعلیم یافتہ نوجوان کے جوش و خروش کا مظاہرہ

کر رہا تھا لیکن جو لوگ دور سے چل کر آئے تھے، بوڑھے اور نحیف و لاغر سکول ماسٹر کو پیر جی کے صاحبزادے اور اس نوعمر لڑکے کو کسی بڑے لیڈر کا نعم البدل سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی تقریر کا اثر اسٹیج کے اردگرد بیٹھنے والے آدمیوں تک محدود تھا۔۔۔ اور جو ذرا دور تھے، وہ بے پروائی سے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔ اچانک اس جلسہ گاہ سے کوئی سو قدم دور سڑک پر دو نئی خوب صورت کاریں اور ان کے پیچھے ایک لاری آ کر رکی جس پر لاؤڈ سپیکر لگا ہوا تھا۔۔۔۔ یونینسٹ امیدوار کار سے اترا۔ اس کے ساتھ ایک کانگرسی مولوی اور اس علاقے کے تین با اثر زمیندار بھی کار سے اترے دوسری کار سے علاقے کا ذیلدار، سفید پوش اور تین نمبردار نمودار ہوئے نتھا سنگھ تھانیدار اور کریم بخش حوالدار نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا یونینسٹ امیدوار کے اشارے سے پروپیگنڈا کی لاری کے لاؤڈ سپیکر پر گراموفون ریکارڈ لگا دیا تھا اور مسلم لیگ کی جلسہ گاہ سے پچھلی صفوں کے لوگ آہستہ آہستہ اٹھ کر سڑک پر جمع ہونے لگے۔ کانگرسی مولوی صاحب لاری کی چھت پر کھڑے ہو گئے اور مائیکرو فون ہاتھ میں لے کر قرآن کی تلاوت کے بعد تقریر شروع کر دی۔ تھوڑی دیر میں اس مسلم لیگ کے جلسہ کی رونق آدھی سے کم رہ گئی۔

مسلم لیگ کے مقابلہ میں یونینسٹ امیدوار کی اس ہنگامہ آرائی کو تقویت دینے کے لیے بازار اور آس پاس کی گلیوں کے ہندو اور سکھ بھی وہاں جمع ہو گئے۔ مسلم لیگ کے جلسے میں تقریر کرنے والے نوجوان نے جب یہ صورت حال دیکھی تو نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ''مسلم لیگ زندہ باد! پاکستان زندہ باد!''

اس کے جواب میں موٹر پر کھڑے ہو کر تقریر کرنے والے مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا "نعرہ تکبیر!" اور اس کے جواب میں بیک وقت دو مختلف آوازیں بلند ہوئیں مسلمان "اللہ اکبر" کہہ رہے تھے لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے بدحواسی کے عالم میں "زندہ باد" کہہ دیا مسلمان ہنس پڑے، وہ ایک دوسرے کو سمجھا رہے تھے۔ "دیکھو بھئی! جب مولوی صاحب نعرہ لگائیں تو اللہ اکبر کہنا چاہیے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے بلند آواز میں کہا "ہندو مسلم اتحاد" تو سکھوں اور ہندوؤں نے "زندہ باد! کہہ کر پہلی غلطی کی تلافی کر دی۔

اچانک سڑک پر ایک جیپ نمودار ہوئی۔ جس پر مسلم لیگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سلیم ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اور پیچھے چار اور نوجوان بھی تھے۔ سلیم کے اشارے سے ڈرائیور نے جیپ مسلم لیگ کے اسٹیج کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ گاؤں کے وہ لوگ جو ابھی تک دل پر جبر کر کے وہاں بیٹھے ہوئے تھے، اٹھ اٹھ کر جیپ سے اترنے والے نوجوانوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوئی یہ کہہ رہا تھا "لیڈر آ گئے" کوئی کہہ رہا تھا "نہیں یار! یہ لیڈر نہیں لیڈر ان کے پیچھے آ رہے ہوں گے۔"

سلیم اور اس کے ساتھی جیپ سے اترے ان میں دو علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور ان کی سیاہ اچکن اور تنگ پاجامے دیکھ کر بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ یہی لیڈر ہیں نوجوان مقرر نے اسٹیج سے اتر کر سلیم اور اس کے ساتھیوں سے مصافحہ کیا اس سے چند سوالات پوچھنے کے بعد سلیم صورت حالات کا جائزہ لے چکا تھا اس نے جلسے کے منتظمین کو تسلی دے کر کہا "آپ فکر نہ کیجئے، ہمارے پاس لاؤڈ

سپیکر موجود ہے، آپ اسے جیپ سے نکلوا کر اسٹیج پر لگوا دیجیے۔"

پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا "بھئی ناصر علی! یہ وہی مولوی ہے، جسے ہم نے پرسوں امرتسر میں بھگایا تھا۔"

"ارے یہ کمبخت یہاں بھی پہنچ گیا" کالی اچکن والے ایک نوجوان نے حیران ہو کر کہا "یار بڑا ڈھیٹ ہے یہ"

لاؤڈ سپیکر فٹ ہو گیا تو سلیم نے کہا "ناصر علی صاحب! ذرا نعت پڑھ دیجیے"

ناصر علی نے اسٹیج پر کھڑے ہو کر نعت شروع کی اور سامنے تقریر کرنے والے مولوی کی آواز اس کی بلند اور دل کش تانوں میں دب کر رہ گئی۔ وہ مسلمان جو تھوڑی دیر قبل جلسے سے اٹھ کر سڑک پر جمع ہو گئے تھے اب واپس آرہے تھے۔

نعت ختم ہوئی تو سلیم مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو گیا لیکن ابھی اس نے تقریر شروع نہیں کی تھی کہ تھانے دار اور کریم بخش حوالدار وہاں آدھمکے تھانیدار نے اسٹیج کے قریب آ کر کہا "شہر میں فساد کا خطرہ ہے، اس لیے آپ یہاں جلسہ نہ کریں!"

سلیم نے جواب دیا اچھا صاحب! لیکن وہ سامنے سڑک پر کیا ہو رہا ہے؟

تھانیدار نے جواب دیا "ادھر مولوی صاحب تقریر کر رہے ہیں"

"تو آپ کا خیال ہے کہ میں یہاں پٹاخے چلانے آیا ہوں؟"

لوگوں نے قہقہہ لگایا اور تھانیدار نے اپنی بدحواسی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم کون ہو؟"

"آپ نے ان مولوی صاحب سے پوچھ لیا ہے کہ وہ کون ہیں؟"

"تمہیں اس سے کیا واسطہ؟ تم میری بات کا جواب دو!"

"سردار جی! آپ پاکستان کے متعلق کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟"

تھانیدار نے قدرے نرم ہو کر کہا "دیکھو جی! میں یہاں دو جلسوں کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تمہارے درمیان اتنا فاصلہ ضرور چاہیے کہ ایک کی آواز دوسرا نہ سن سکے یہ میری ڈیوٹی ہے۔"

"ٹھیک ہے سردار صاحب! انہوں نے خواہ مخواہ اس جلسے میں خلل ڈالنے کے لیے لاری لا کر یہاں کھڑی کر دی ہے۔ انہوں نے یہ بھی خیال نہیں کیا کہ آپ یہاں ڈیوٹی پر کھڑے ہیں یہ یونینسٹ بہت شریر ہیں۔ یہ فساد کا بیج بوتے ہیں اور بدنام ہو جاتے ہیں آپ جیسے افسر آپ انہیں کہیں کہ موٹر یہاں سے ہٹالیں اور اگر پٹرول نہ ہونیکی وجہ سے موٹر یہاں رک گئی ہے تو سپاہیوں کو کہیں کہ اسے دھکیل کر ذرا دور لے جائیں۔"

کریم بخش حوالدار نے تلخ ہو کر کہا "دیکھو! تم تم نے تقریر کی تو ہم لاٹھی چارج کر دیں گے"

سلیم نے اطمینان سے جواب دیا "کیسے بدتمیز ہو تم! میں تمہارے افسر سے بات کر رہا ہوں اور تم خواہ مخواہ بیچ میں ٹانگ اڑا رہے ہو تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ جب تھانیدار کسی کے ساتھ بات کر رہا ہو تو حوالدار کو خاموش رہنا چاہیے!"

تھانیدار پہلے ہی اس الجھن سے باہر نکلنے کا موقع تلاش کر رہا تھا وہ حوالدار پر برس پڑا۔ "تم کون ہو بیچ میں بولنے والے اور لاٹھی چارج کرنے کے لیے کس الو

کے پٹھے نے کہا ہے۔‘‘

تھوڑی دیر بعد سلیم تقریر کر رہا تھا تھانیدار نہ ادھر تھا نہ ادھر، بلکہ درمیان میں کھڑا اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

گزشتہ تین ہفتوں میں امرت سر اور گورداسپور کے اضلاع کے دورہ کرنے کے بعد سلیم یہ سمجھ چکا تھا کہ شہروں کے باشندوں کو پاکستان کا حامی بنانے کے لیے اب تقریروں کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ شہروں کے تاجر، مزدور اور ملازم پیشہ مسلمان ہندو ذہنیت کو خوب سمجھتے ہیں اور کانگرس یونینسٹ مسلمان کے کندھے پر اپنی بندوق رکھ کر انہیں فریب نہیں دے سکتی۔ شہروں کے تعلیم یافتہ بچے اور بوڑھے طرے اور لنگوٹی کے ناپاک اتحاد کے خلاف میدان میں آ چکے تھے، لیکن دیہات میں تعلیم یافتہ لوگ بہت کم تھے اور ان میں سے اکثر گھروں سے باہر سرکاری دفاتر میں کام کرتے تھے اور وہ چھوٹے یا بڑے تعلیم یافتہ زمیندار جو ملازم نہیں تھے، تھانیداروں، تحصیلداروں، ذیلداروں اور پولیس کے سپاہیوں، آنریری مجسٹریٹوں اور جھوٹی گواہیاں دینے والے معتبروں سے بہت مرعوب تھے۔ تاہم سلیم یہ اندازہ لگا چکا تھا کہ ان میں سے بھی ستر یا اسی فیصدی ایسے ہیں جو بظاہر ابن الوقت یونینسٹوں کے ساتھ ہیں، لیکن وقت آنے پر پاکستان کو ووٹ دیں گے اگر وقت سے پہلے انہیں یہ پتہ چل گیا کہ اس انتخاب کے بعد پانچ دریاؤں کی سرزمین سے طرے کا اقتدار ختم ہونے والا ہے، تو وہ علی الاعلان پاکستان کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں آ جائیں گے سب سے اہم مسئلہ دیہات کے ان پڑھ عوام کا تھا جن کے ووٹوں کی قیمت

چکانے کے لیے زمیندار لیگ کے چندے میں سود در سود لینے میں اور بلیک مارکیٹ کرنے والے مہاشوں کا فالتو روپیہ بھی شامل ہو چکا تھا دیہات کے لوگ ان معتبروں کو جو پانچ روپے کے عوض جھوٹی گواہی دینے کے لیے دس دس میل پیدل جایا کرتے تھے، اب خوبصورت کاروں پر یونینسٹ امیدواروں کے حق میں نعرے لگاتے دیکھ رہے تھے، وہ دیہاتیوں کے ساتھ اس قسم کی عام فہم باتیں کیا کرتے تھے:

''تمھیں مٹی کے تیل کی ضرورت ہے؟''

''جی ہاں!''

''اور تمھیں کھانڈ بھی نہیں ملتی؟''

''جی وہ بھی نہیں ملتی''

''تمھیں کپڑے کی بھی ضرورت ہے؟''

''جی ہاں! اب تو مردوں کے لیے کفن بھی نہیں ملتے۔''

''یونینسٹ امیدواروں کو ووٹ دو۔ تمھیں مٹی کا تیل بھی ملے گا، کھانڈ بھی ملے گی اور مردوں کے لیے کفن بھی ملیں گے کفن مفت ملیں گے۔''

''جی مفت؟''

''ہاں! بالکل مفت یونینسٹ پارٹی زمینداروں اور کسانوں کی پارٹی ہے تمہارے لیے ہر گاؤں میں اسکول اور ہسپتال کھولے جائیں گے۔ بجلی کی روشنی کا انتظام ہوگا۔ لگان بالکل کم کر دیا جائے گا۔۔۔۔۔ ہاں! کفن کی اگر کسی کو ضرورت ہو تو اب بھی مفت مل سکتا ہے امیدوار خود تقسیم کرتا ہے۔''

گاؤں کے بچے خوب صورت کار کے گرد جمع ہو جاتے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ موٹر والوں کو بے تکلفی سے باتیں کرتے دیکھ کر وہ موٹر کے ساتھ بے تکلف ہو جاتے، کوئی ہارن بجاتا۔ کوئی مڈگارڈ پر بیٹھ کر گنا چوستا۔ بزرگ انہیں ڈانٹے لیکن کار والے کہتے ''بھئی! بچوں کو کچھ نہ کہو، ڈرائیور! ذرا ان کو سیر کرا دو۔ ہاں بھئی! ذرا نعرہ لگاؤ'' فلاں چودھری زندہ باد! زمیندار اور کسان زندہ باد! اور گاؤں کے بچے اسے موٹر پر سواری کی فیس سمجھ کر نعرے لگا دیتے۔

سلیم اس اجتماع میں ان لوگوں کی بڑی تعداد دیکھ رہا تھا جو اس قسم کے پروپیگنڈے سے مرعوب کیے جا رہے تھے چنانچہ اس کی تقریر ان تقریروں سے بہت مختلف تھی، جو شہر کے لوگوں کے لیے کی جاتی تھیں وہ کہہ رہا تھا:

''بھائی! آج میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ میرے سامنے ایک مسلمان مولوی تقریر کر رہا ہے اور مسلمانوں سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں ۔۔۔۔ اور وہ خوشی سے زیادہ ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہیں ۔۔۔۔۔ اور وہ خوشی سے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤ کہ تم نے پہلے کبھی یہ تماشا دیکھا ہے کہ ایک مولوی وعظ کر رہا ہو اور ہندو اور سکھ بھائی اس کے گرد جمع ہوں؟''

سامعین میں سے بعض نے جواب دیا ''نہیں''

''اچھا بھائی! تم نے کبھی یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسا خضر صورت مولوی قرآن اور حدیث سنا رہا ہو، اور ہمارے ہندو اور سکھ بھائی اس کے گلے میں پھولوں کے ہار

ڈال رہے ہوں؟"

"نہیں" لوگوں نے جواب دیا۔

"اچھا بھئی! یہ بتاؤ کہ وہ دو کاریں اور وہ موٹر جس کی چھت پر مولوی صاحب کھڑے تقریر کر رہے ہیں، کس کی ہیں؟"

ایک نوجوان نے اٹھ کر جواب دیا "یونینسٹ امیدوار کی"

"لیکن بھئی! میں نے تو یہ سنا ہے کہ اس کے پاس اپنا صرف ایک ٹانگہ تھا اور وہ بھی ٹوٹ چکا ہے یہ نئی کاریں کہاں سے آ گئیں؟"

ایک شخص نے جواب دیا "یہ دونوں کاریں سیٹھ دھنی رام کی ہیں، اور لاری سردار گوپال سنگھ کی ہے۔"

"تو بات یوں ہے کہ سیٹھ دھنی رام نے مسلم لیگ کے مخالف امیدوار کو انتخاب کی جنگ کے لیے اپنی کاریں دی ہیں گوپال سنگھ نے اپنی لاری دی ہے اور لاؤڈ سپیکر بھی شاید کسی سردار صاحب یا سیٹھ صاحب نے دیا ہو۔ ہمیں اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ انہوں نے ضرورت کے وقت ہمارے ایک غریب بھائی کی مدد کی ہے، لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ جب ہندو ساہوکار ایک غریب کسان سے قرضہ وصول کرتا ہے تو اس کے گھر سے دو آنے کا توا بھی قرق کرا لیتا ہے لیکن آج یونینسٹ امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں دے رہے ہیں، روپیہ دے رہے ہیں۔ کل تک یہ لوگ کفن کا کپڑا بھی بلیک مارکیٹ میں بیچتے تھے لیکن اب مسلم لیگ کے مخالف امیدواروں کو، سینکڑوں تھان مفت دیے جا رہے ہیں تا کہ وہ تمہیں مفت کفن دے کر

ووٹ حاصل کر سکیں۔۔۔میں پوچھتا ہوں کہ آج ہمارا ہندو بھائی جو سود در سود لے کر ایک آنے کا ایک روپیہ بنانے کا عادی تھا، اس قدر فضول خرچ کیوں ہو گیا ہے؟''

اس سوال کا جواب شاید تم نہ دے سکو اچھا یہ بتاؤ کہ ہندو پاکستان کا مخالف ہے یا نہیں؟[

''مخالف ہے'' سامعین نے جواب دیا

''اور وہ چودھری صاحب جو اس کے پیسوں سے مسلم لیگ کے خلاف انتخاب لڑ رہے ہیں؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''اور سکھ جنہوں نے انہیں اپنی لاری دی ہے؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''اور یہ مولوی صاحب، جن کی تقریر سن کر ہندو اور سکھ بھائی خوش ہو رہے ہیں؟''

''یہ بھی مخالف ہیں''

''اور وہ تھانیدار صاحب جو ابھی مجھ پر ناراض ہو رہے تھے؟''

''وہ بھی مخالف ہیں''

''لیکن کیوں؟''

لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے سلیم نے قدرے تامل کے بعد کہا:

''بھئی! پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ جن علاقوں میں مسلمان زیادہ ہیں، وہاں

مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں''

''لیکن ہندو کو اعتراض ہے وہ کہتا ہے کہ جہاں ہندو زیادہ ہیں، وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں بھی میری حکومت ہونی چاہیے اور اگر چند دن کے لیے پاکستان کی مخالفت کرنے والے مسلمان امیدواروں کو وہ اپنی موٹریں، کھانڈ کی بوریاں اور کفن کے لیے کپڑا دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنا سکتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یہ سودا مہنگا نہیں۔ اس کا ساہوکارہ ہوگا، اسی کا قانون ہوگا، اسی کی عدالتیں ہوں گی۔ وہ آج اگر ایک روپیہ خرچ کر رہا ہے، تو اس امید پر کہ کل وہ ایک لاکھ وصول کر سکے گا۔۔۔ اگر وہ پانچ سو یا ایک ہزار آدمیوں کو مفت کفن دے کر دس کروڑ مسلمانوں کو ذلت، افلاس اور غلامی کے قبرستان کی طرف دھکیل سکتا ہے تو یہ سودا مہنگا نہیں۔''

کانگرسی مولوی اس سے پہلے بھی اس قسم کی تقریر سن چکا تھا سلیم کے ساتھ امرتسر کے ایک قصبے میں اس کی مٹھ بھیڑ ہو چکی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اس سیدھی سادی راگنی کی جو تان اس پر ٹوٹنے والی ہے، وہ خطرناک ہے۔ وہ تقریر کرتے کرتے رک جاتا اور سمت مخالف سے چند الفاظ سننے کے بعد پھر کوئی بات شروع کر دیتا لیکن اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔

سلیم کہہ رہا تھا۔۔۔ ''کانگرسی ہندو یا سکھ پاکستان کے اس لیے مخالف ہیں کہ وہ سارے ہندوستان پر ہندو کا راج چاہتے ہیں یہ یونینسٹ مسلمانوں کا گروہ اس

لیے پاکستان کے مخالف ہے کہ انہوں نے انگریز کے بعد ہندو کو اپنا مائی باپ بنالیا ہے لیکن تم حیران ہو گے کہ وہ خضر صورت مولوی صاحب جن کے سر پر ہندو کی سی چوٹی ہے، نہ سکھوں کے سے بال اور نہ یونینسٹوں کا سا طرہ، انہیں پاکستان کی مخالفت سے کیا ملتا ہے؟''

سلیم کے ایک ساتھی نے اٹھ کر جواب دیا ''دال روٹی اور کیا!''

اب لوگ مولوی صاحب کی طرف دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہے تھے سلیم نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے کہا ''نہیں بھئی! دال روٹی کے لیے کوئی شخص اتنا بدنام ہونا گوارا نہیں کرتا۔ یہ مرغ اور حلوے کی ڈکاریں ہیں۔۔۔۔ لیکن مولوی صاحب کو یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ہندو بھائی حلوہ اور پلاؤ کھلا کر ان سے کیا کام لے رہے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ شکاری کانٹے کے ساتھ مچھلی کیسے پکڑتا ہے؟ وہ ڈوری کے ساتھ کانٹا باندھتا ہے؟ پھر ایک کیڑا پکڑتا ہے جسے کیچوا کہتے ہیں اور اسے کانٹے کے ساتھ لگا کر پانی میں پھینک دیتا ہے مچھلی سمجھتی ہے کہ یہ اس کی غذا ہے وہ منہ کھول کر اس کی طرف دوڑتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کانٹا اس کے حلق میں پھنس جاتا ہے۔ بھائی! تم مچھلیاں ہو، ہندو شکاری ہے، یونینسٹ امیدوار کانٹا ہے اور یہ مولوی کیچوا ہے۔ اس کی شکل سے دھوکا نہ کھاؤ! یہ بڑا خطرناک ہے ہندو شکاری یہ سمجھتا ہے کہ اس کی شکل وصورت مسلمانوں کو دھوکا دے سکتی ہے۔''

اب کانگرسی مقرر ایک ہدف تھا اور سلیم کے ترکش کے تمام تیروں کا رخ اس کی طرف تھا جب وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہوتا تو سکول کے لڑکے یہ کہنا شروع کر

دیتے ''مولوی کیچوا۔۔۔۔مولوی کیچوا۔۔۔۔مولوی کیچوا ہائے ہائے'' بعض لڑکے اب جلسے سے اٹھ کر ایک دکان کی چھت پر جا چڑھے اور ان کے نعرے موٹر کے گرد کھڑے ہونے والے لوگوں کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔

مولوی صاحب ایک حساس طبیعت کے آدمی تھے وہ سب کچھ برداشت کر سکتے تھے لیکن کانگرس کے تمام انعامات کے عوض انہیں اس نئے لقب سے سرفراز ہونا گوارا نہ تھا۔اب بچوں کی آوازوں کے ساتھ دیہاتیوں کے قہقہے بھی شامل ہو گئے۔ یہ نئی صورت حال اور بھی زیادہ المناک تھی اور پھر جب چھت پر بیٹھے ہوئے بچوں نے ایک ساتھ ''مولوی کیچوا ہائے ہائے'' کہنا شروع کیا اور بعض ہندو سکھ بھی ہنس پڑے تو ان کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور وہ قائد اعظمؒ کو برا بھلا کہنے کے بعد نیچے اتر آئے۔

جب ان کی موٹر روانہ ہو رہی تھی تو لڑکے آگے آگے بڑھ بڑھ کر نعرے لگا رہے تھے۔انہوں نے ایک لڑکے کو تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن غصے کی حالت میں وہ موٹر کی کھڑکی کا شیشہ نہ دیکھ سکے چنانچہ ان کا ہاتھ جس تیزی کے ساتھ اٹھا تھا اس سے زیادہ پھرتی کے ساتھ واپس آیا وہ تلملا کر ہاتھ جھٹک رہے تھے کہ ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا ذیلدار بلبلا اٹھا ''ارے ظالم! مار ڈالا''

اگلی سیٹ سے یونینسٹ امیدوار نے مڑ کر دیکھا۔ذیلدار صاحب کا ہاتھ ان کی دائیں آنکھ پر تھا ''کیا ہوا چودھری صاحب'' اس نے سوال کیا

''مولوی نے میری آنکھ میں انگوٹھا ٹھونس دیا ہے تو بہ میری ان کے ناخن ہیں یا

نشتر؟"

مولوی صاحب کو کار سے باہر کھینچا جا رہا تھا ان کے ہاتھ میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور اب ان کے ناخنوں کی تعریف ہو رہی تھی وہ کہنے لگے؟ "لاحول ولا قوۃ" دیکھو جی! میرے ناخن بڑے ہیں یا ذیلدار کے؟

ذیلدار نے اپنی پگڑی کا پلو گول مول کر کے اپنی آنکھ میں ٹھونستے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ کے ناخن بڑے نہیں، ورنہ آپ نے میری آنکھ نکالنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی خدا کی قسم! آپ تھوڑا سا زور اور لگا دیتے تو معاملہ ختم تھا"



رات کے وقت سلیم اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے ایک ٹھیکیدار کے ہاں قیام کیا کھانا کھانے کے بعد وہ اگلے دن کا پروگرام تیار کر رہے تھے کہ شہر کے چند معززین آ گئے ان کے ساتھ وہ بوڑھا سکول ماسٹر بھی تھا جس نے شام کے جلسے کی صدارت کی تھی اس نے سلیم اور اس کے ساتھیوں سے ان لوگوں کو متعارف کرانے کے بعد کہا "بھئی آج آپ لوگ آ گئے، خدا نے ہماری عزت رکھ لی، ورنہ حالات بہت خراب ہو چکے تھے آپ لوگ بہت کام کر رہے ہیں خدا کا شکر ہے کہ آپ جیسے نوجوان بیدار ہو گئے ہیں میں نے سنا ہے کہ علی گڑھ سے بھی کافی طلباء یہاں پہنچے ہیں؟"

سلیم نے کہا "جی ہاں! یہ مسٹر ناصر علی اور مسٹر ظفر، علی گڑھ یونیورسٹی کے طالب

علم ہیں ناصر صاحب صوبہ بہار کے رہنے والے ہیں اور ظفر صاحب کا وطن یو پی ہے اور یہ مسٹر عزیز اور جعفر لاہور سے آئے ہیں۔''

ماسٹر نے کہا ''خدا تمہیں ہمت دے!''

اس کے بعد اہل مجلس کی توجہ ناصر علی اور ظفر کی طرف مبذول ہو گئی کسی نے سوال کیا ''آپ کے صوبوں میں تو مسلم لیگ کی کامیابی یقینی ہے نا؟''

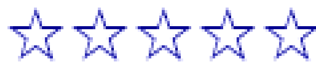
ناصر نے جواب دیا'' جی ہاں! وہاں ہمیں کوئی خطرہ نہیں وہاں کے مسلمان ہندوؤں کے ستائے ہوئے ہیں وہاں کانگرس کے ایجنٹ کسی کو دھوکا نہیں دے سکتے۔۔۔سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں عوام کو اس لیے پاکستان کی ضرورت کا احساس نہیں کہ ہندو یہاں انہیں بے ضرر نظر آتا ہے۔ اگر ایک پنجابی یا پٹھان کو یہ کہا جائے کہ ہندو بڑا وحشی اور ظالم ہے تو وہ ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو گا کیونکہ وہ یہاں اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ بالخصوص سرحد کے پٹھان سے اگر ہم ایسی بات کریں تو وہ ہمارا مذاق اڑائے گا۔ اس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتا کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ بدسلوکی کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ صوبہ سرحد میں پاکستان کا نعرہ ابھی تک زیادہ مقبول نہیں ہوا۔۔۔۔یو پی، بہار اور اقلیت کے دوسرے صوبوں میں ہمارا بچہ بچہ پاکستان پر قربان ہونا چاہتا ہے۔ وہاں یہ حالت ہے کہ ہندو حلوائی کی کڑاہی اگر کتا چاٹ رہا ہو تو وہ اسے دھتکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا لیکن اگر سودا لیتے وقت مسلمان اس کے ہاتھ سے چھو جائے تو وہ مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔''

ایک نوجوان نے کہا ''یہ تو آپ نے ٹھیک کہا لیکن میں پوچھتا ہوں کہ پاکستان کے قیام سے سرحد، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے صوبوں کی مسلم اکثریت کو تو یقیناً فائدہ پہنچے گا، کیونکہ وہ آزاد ہوں گے اور ان کی اپنی حکومت ہو گی۔ ان کے لیے فلاح و ترقی کی راہیں کھل جائیں گی۔ لیکن آپ لوگوں کو جو اقلیت کے صوبوں میں ہیں۔ اس سے کیا فائدہ حاصل ہو گا؟ میرا مطلب یہ نہیں کہ آپ کے ایثار کی میرے دل میں کوئی قدر نہیں لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ قیام پاکستان کے بعد اگر ہندو نے آپ سے انتقام لیا تو آپ کی بے بسی بہت زیادہ ہو جائے گی۔ اس صورت میں آپ کیا کریں گے؟''

حاضرین مجلس اس سوال سے بہت برہم تھے لیکن ناصر نے اطمینان سے جواب دیا'' آپ یہ سمجھتے ہوں گے کہ پاکستان کی حمایت میں ہمارے نعرے محض سطحی جذبات کی پیداوار ہیں اور ہم نے اپنے مستقبل کے متعلق نہیں سوچا لیکن ہم کسی اور رنگ میں سوچتے ہیں ہم یہ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو کی غلامی قبول کریں دوسرا یہ کہ وہ ہندوستان میں اپنی اکثریت کے علاقوں میں آزاد اور خود مختار ہو جائیں۔ پہلی صورت میں ہم سب ہندو کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ درہ خیبر سے لے کر خلیج بنگال تک رام راج کا جھنڈا لہرائے گا۔ ہم سب استبداد کی ایک ہی چکی میں پس رہے ہوں گے اور ہم سب کا مستقبل یکساں تاریک ہوگا۔ دوسری صورت میں کم از کم مسلم اکثریت کے صوبے ہندو کی غلامی سے بچ جائیں گے اور ہم یہ کہہ سکیں گے کہ

پاکستان ہمارے آزاد بھائیوں کا وطن ہے بیشک ہندو کا سلوک ہمارے ساتھ بیحد سفاکانہ ہوگا لیکن ہم اس امید پر جی سکیں گے کہ ہمارے بھائیوں کو ایک آزاد وطن مل چکا ہے اور وہ ہمارے حال سے بے پروا نہیں اگر راجہ داہر کے قید خانے سے ایک مسلمان لڑکی کی فریاد نے دمشق کے ایوانوں میں تہلکہ مچا دیا تھا تو آپ تین چار کروڑ مسلمانوں کی فریاد سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں نہیں ٹھونس لیں گے۔ اگر قوم کی مائیں بانجھ نہیں ہوگئیں تو کوئی محمد بن قاسمؒ اور کوئی محمود غزنویؒ ضرور پیدا ہوگا پاکستان کی سر زمین سے کوئی مرد مجاہد ہماری فریاد سن کر ضرور تڑپ اٹھے گا بیشک ایک عبوری دور کے لیے ہمارے گرد تاریکیوں کا ہجوم ہوگا لیکن ہمارے دلوں میں امید کے چراغ جگمگاتے رہیں گے ہم اپنے ظلمت کدوں میں بیٹھ کر پاکستان کی خاک سے نمودار ہونے والے سورج کا انتظار کریں گے اور فرض کیجئے پاکستان میں ہمارے آزاد بھائی ہمیں بھول بھی جائیں یا ہماری فریاد انہیں متاثر نہ کر سکے تو بھی ہم اسے خسارے کا سودا نہیں سمجھ سکتے ہمیں مرنے کے بعد بھی یہ تسکین ضرور حاصل ہوگی کہ جن سفاک ہاتھوں نے ہمارا گلا گھونٹا ہے، وہ ہمارے بھائیوں کی شاہ رگ تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم اگر عزت اور آزادی کی زندگی میں ان کے ساتھی نہ بن سکے تو یہ ہمارے مقدر کی بات ہے لیکن ہم یہ گوارا نہیں کریں گے کہ ذلت اور غلامی کی موت میں آپ بھی ہمارے ساتھی بن جائیں اگر ہم آپ کے ساتھ تیر کر ساحل تک نہیں جا سکتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ بھی ہمارے ساتھ ڈوب جائیں۔''

ناصر کی آواز بیٹھ چکی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جھلک رہے تھے۔



صوبہ سرحد کے سوا مسلم لیگ ہر صوبے میں بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئی پنجاب میں یونینسٹوں کا سفینہ انتخابات کے بھنور کی نذر ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں انہوں نے بہت بڑی شکست کھائی تھی۔ جہاں لیگ کے اسی امیدوار کامیاب ہوئے تھے، وہاں ابن الوقتوں کی تعداد فقط نو تھی لیکن سکھوں اور ہندوؤں نے یونینسٹ اقتدار کے گرتے ہوئے محل کو سہارا دیا۔ انگریز گورنر نے ان کی سرپرستی فرمائی اور مسلم لیگ کے جو صوبے کی سب سے بڑی پارٹی تھی، نظر انداز کر کے خضر حیات کو وزارت کی تشکیل کا موقع دیا۔ چند ملت فروشوں کے باعث پنجاب کے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبہ میں اقلیتوں کے محکوم ہو چکے تھے مسلم لیگ ایک ہندو یا سکھ کو بھی اپنے ساتھ نہ ملا سکی، کیونکہ پنجاب میں لیگی وزارت کے قیام سے انہیں پاکستان کے محاذ کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ تھا لیکن کانگرس کو پاکستان کے خلاف سامراجی مقاصد کی توپ کھینچنے کے لیے وہ آزمودہ کار خچر مل چکے تھے۔ جنہیں انگریز نے اپنے سیاسی اصطبل میں بڑے شوق اور محنت سے پالا تھا۔

صوبہ سرحد میں کانگرس کی وزارت بن چکی تھی سندھ میں بھی ابن الوقت مسلمانوں کا ایک ٹولا وزارت کا توبرا دیکھ کر کانگرس کے اقتدار کی رتھ کھینچنے کے لیے تیار تھا لیکن مسلم لیگ وزارت بنانے میں کامیاب ہو گئی۔ بنگال میں مسلم لیگ کی اکثریت اس قدر نمایاں تھی کہ کانگرس کو جوڑ توڑ کا موقع نہ ملا بہر حال کانگرس اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ ہندو اکثریت کے تمام صوبوں پر اس کا

تسلط تھا اور وہاں ہندو عوام کو پاکستان کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے منظم کیا جا رہا تھا۔ کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی میں ہندو مہا سبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کی افواج کیل کانٹے سے لیس ہو رہی تھیں۔ ہندو مہاجن انہیں روپے دے رہے تھے اور ہندو ریاستوں سے ان کے پاس اسلحہ اور بارود پہنچ رہا تھا۔۔۔۔۔ مدافعانہ جنگ کے لیے پنجاب اور سرحد مسلمانوں کے اہم تعین مورچے تھے لیکن یہاں بھی سکھوں کے گوردوارے اسلحہ سازی کی فیکٹریوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ ہندوؤں کے مندروں اور اسکولوں میں راشٹریہ سیوک سنگھ کی فوجیں تیار ہو رہی تھیں لیکن شاہ پور کا وہ سیاست دان جس نے اپنی قوم کی بقا اور آزادی کے عوض وزارت کا سودا کیا تھا، خاموش تھا۔ پنجاب کا مورچہ مضبوط بنانے کے لیے ہندو اور سکھ صوبہ سرحد سے اسلحہ بھیج رہے تھے لیکن عدم تشدد کے دیوتا کے سرحدی چیلے اس صورت حالات سے قطعاً پریشان نہ تھے۔

ہندوستان کے سیاسی اکھاڑے میں کانگرس کی جدوجہد بظاہر آئینی تھی لیکن در پردہ وہ اپنے جارحانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے تیاریاں کر رہی تھی۔

مسلمانوں کا سنجیدہ طبقہ اس صورت حالات سے بے خبر نہ تھا لیکن پنجاب اور سرحد میں ان کے دفاعی مورچوں پر چند افراد کی ملت فروشی، یا کوتاہ اندیشی کے باعث دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا۔

برطانیہ کا وزارتی مشن اپنی تجاویز لے کر آیا ان تجاویز میں نہ وہ اکھنڈ ہندوستان تھا جو کانگرس چاہتی تھی اور نہ وہ پاکستان تھا جس کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا تھا۔

گروپ بندی کی صورت میں مسلمانوں کے تحفظ کے تھوڑے بہت امکانات دیکھ کر مسلم لیگ اپنے اصل مطالبہ سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہوگئی لیکن کانگرس کو مرکز کے اختیارات کا محدود ہو جانا گوارا نہ تھا۔ اس کے فسطائی مقاصد کی تکمیل کے لیے مرکز میں ہندو اکثریت کے اختیارات کا لامحدود ہونا ضروری تھا۔ گروپ بندی میں مسلم اکثریت کے علاقوں کو جو معمولی خود اختیاری ملتی تھی، اس میں کانگرس کے سیاسی مہاتما کو اپنی ماہ ۔سبھائی خوردبین کی بدولت پاکستان کے خطرناک جراثیم نظر آ گئے تھے۔ چنانچہ وہ اس تجویز کے بانیوں کو اپنے مخصوص انداز میں یہ سمجھا رہے تھے کہ تمہارا مطلب یقیناً وہ نہیں جو تم سمجھتے ہو عبوری دور کی حکومت کے لیے بھی کانگرس مسلم لیگ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مانگتی تھی چنانچہ مرکزی کابینہ کی تشکیل کے لیے وائسرائے نے پانچ کانگرس پانچ مسلم لیگ اور دو اقلیتوں کی نسبت کو چھ، پانچ اور دو کی نسبت میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد کانگرس لمبے عرصہ کے لیے وزارتی مشن کی تجویز کی لنڈنی زبان کا واردھائی ترجمہ نافذ کرنے پر مصر تھی اور جب تجاویز کے بانیوں نے یہ کہہ دیا کہ ہمارا مطلب وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے تو گاندھی کی آتما کو دکھ ہوا تجاویز رد کر دی گئیں۔

وائسرائے لارڈ ویول یہ اعلان کر چکا تھا کہ اگر کوئی پارٹی رضامند نہ ہوئی تو بھی اس کے تعاون کے بغیر عبوری دور کے لیے مرکزی کابینہ کی تشکیل کی جائے گی۔۔۔۔ اعلان کے مطابق اب لیگ کو کابینہ کی تشکیل کا موقع ملنا چاہیے تھا، لیکن مسلم لیگ کو جلد یہ معلوم ہو گیا کہ اس نے انگریز کے وعدوں پر اعتبار کرنے میں

دھوکا[1] کھایا ہے۔

---

[1] اس نئی صورت حالات میں سر کرپس نے یہ کہہ کر کانگرس کی مشکل حل کر دی کہ کانگرس نے لمبے عرصے کی تجاویز مان لی ہیں، اس لیے عبوری دور کی حکومت کی تشکیل کی پیشکش واپس لی جاتی ہے۔

دراصل ہندو اور انگریز کے اس تمام ہیر پھیر کا مقصد پاکستان کی چٹان سے مسلم لیگ کے پاؤں متزلزل کرنا تھا اب مسلم لیگ ہوا کا رخ دیکھ چکی تھی اور چند قدم ڈگمگانے کے بعد اس کا رخ پھر اپنی اصلی منزل مقصود یعنی پاکستان کی طرف ہو چکا تھا۔

مسلمان کے میدان سے نکلتے ہی انگریز اور ہندو نے ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور لارڈ ویول عبوری دور کے لیے کانگرس کو تشکیل وزارت کی دعوت دینے کا تہیہ کر چکے تھے۔ مسلم لیگ کا آخری حربہ ڈائرکٹ ایکشن تھا جو انگریز کی ہندو نواز پالیسی کے خلاف احتجاج تھا لیکن ہندو اپنے آپ کو انگریز کا جانشین سمجھ کر میدان میں آ چکا تھا۔ بمبئی، احمد آباد، الہ آباد اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ ہندو نے لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کر دی اس کے بعد کلکتہ کی باری آئی اور یہاں ڈائرکٹ ایکشن کے دن مسلم لیگ کے جلوس پر اینٹوں گولیوں اور ردی بموں کی بارش کی گئی۔ ان حالات میں وائسرائے نے آگ پر مزید تیل چھڑکنا ضروری سمجھا اور مرکزی میں کانگرس کی وزارت بنا دی۔۔۔۔

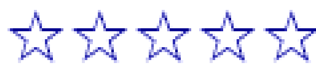
وہ ہندو جس نے اقتدار حاصل ہو جانے کی امید پر اتنا کچھ کیا تھا، اب طاقت کے

نشے میں چور ہو چکا تھا پنڈت نہرو کے وزارت عظمےٰ کا قلمدان سنبھالتے ہی اعلان کیا کہ میری وزارت مخالفین کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اپنی ساری قوت صرف کر دے گی پٹیل نے بمبئی میں تقریر کی اور وہاں فساد کی سلگتی ہوئی آگ کے شعلے زیادہ تیز ہو گئے۔

ابھی تک مسلم اکثریت کے کسی شہر یا علاقے میں فساد نہیں ہوا تھا لیکن ہندوؤں نے کلکتہ میں جو آگ لگائی تھی، اس کے چند شعلے نوا کھالی جا پہنچے۔ یہ مسلم اکثرت کا علاقہ تھا اور کلکتہ کے کچھ پناہ گزین ہندوؤں کے ہاتھوں اپنی لرزہ خیز داستانیں سنانے کے لیے وہاں پہنچ چکے تھے چنانچہ فساد شروع ہو گیا۔ مسلم لیگی وزارت کا عہدہ دار اور لیڈر صورت حالات پر قابو پانے کے لیے فوراً وہاں پہنچے۔۔۔۔۔ صلح اور امن کے لیے اپیلیں کی گئیں اور صورت حالات پر قابو پا لیا گیا۔ مسلم پریس کی اطلاعات کے مطابق قتل ہونے والے ہندوؤں کی تعداد پچاس اور سو کے درمیان تھی اور بعض لیڈر اسے چھ1 سے تک شمار کرتے تھے اس کے برعکس صرف کلکتہ میں تین ہزار مسلمان قتل کیے جا چکے تھے لیکن ہندو اور مسلمان کے قتل میں بہت فرق تھا۔ مہاتما گاندھی کی وہ آتما جس نے انتہائی صبر و سکون سے بمبئی، الہ آباد، احمد آباد، کانپور اور دوسرے شہروں میں ہزاروں مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اترتے دیکھا تھا، بے چین ہو گئی۔ ہندو پریس نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ مہاتما گاندھی دہلی کی بھنگی کالونی سے مسلمانوں کی سفاکی کا ڈھنڈورا پیٹتا ہوا اٹھا اور نوا کھالی پہنچ گیا اور وہاں سے یہ خبریں آتی تھیں کہ آج مہاتما گاندھی نے اتنے میل پیدل سفر کیا

ہے۔آج مہاتماجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور ہندوستان کے طول وعرض میں مہاتماجی کے چیلے ان کے آنسو پونچھنے کی تیاریاں کر رہے تھے بالآخر وہ آتشیں مادہ پھوٹ نکلا جو بھارت ماتا کے سینے میں مدت سے پک رہا تھا عدم تشدد کے دیوتا کے پجاری بہار کے مسلمانوں کو آگ اور خون کا پیغام دے رہے تھے ہندو فسطائیت، وحشت، بربریت اور سفاکی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہی تھی۔

1 یہاں تعداد گھٹا کر دکھانا مقصود نہیں مسلم اکثریت کے علاقے میں ہندوؤں کا تھوڑا یا بہت قتل بہ ہر حال افسوس ناک بات تھی۔ اگر اس میں لیگی وزارت یا کسی اور ذمہ دار سیاسی پارٹی کا ہاتھ ہوتا تو یہ بات اور بھی شرم ناک ہوتی لیکن موقع پر پہنچنے والے بنگالی ہندوؤں کے اپنے بیانات کی تصدیق کرتے ہیں کہ نہ صرف مسلم لیگ کے لیڈروں اور وزارت نے اس فساد کو دبانے کی کوشش کی بلکہ مسلمانوں نے اپنے گھروں میں ہندوؤں کو پناہ دی۔ ایسے حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط ہو گا، کہ یہ مقامی مسلمانوں کی سازش نہ تھی بلکہ ایسا حادثہ تھا جس کے اسباب بمبئی، کلکتہ اور دوسرے شہروں سے فراہم ہو چکے تھے۔



گھر میں مجید کی شادی کا اہتمام ہو رہا تھا۔ لائل پور سے اس کی بہن امینہ اپنے شوہر کے ساتھ دوپہر کی گاڑی سے آنے والی تھی سلیم اور مجید انہیں لینے کے لیے

اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے گاڑی آئی امینہ کا خاوند انٹر کلاس کے ڈبے سے اترا ساتھ والے زنانہ ڈبہ کی کھڑکی سے امینہ نے اپنے برقعے کا نقاب اٹھا کر باہر جھانکا۔ سلیم نے آگے بڑھ کر اس کی گود سے آٹھ دس ماہ کا بچہ لے لیا امینہ نے ماں بننے کے بعد پہلی بار سلیم کو دیکھا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھا گئی۔ وہ لجاتی، شرماتی اور سمٹتی ہوئی گاڑی سے اتری۔ نوکر سامان اتار چکا تھا اور مجید اپنے بہنوئی کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ سلیم نے پلیٹ فارم پر شیشم کے درخت کے نیچے لکڑی کے بنچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''امینہ وہاں بیٹھ جاؤ! ذرا بھیڑ کم ہو جائے تو چلتے ہیں۔ امینہ کا خاوند اور مجید بھی وہاں آ گئے مجید نے نوکر سے کہا تم جا کر ٹانگے میں سامان رکھو ہم ابھی آتے ہیں'' نوکر چلا گیا۔ امینہ کے خاوند نے سلیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''سلیم صاحب! آپ کی بہن آپ سے بہت ناراض ہے۔''

سلیم نے امینہ کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا ''کیوں ری چڑیل! مجھ سے خفا ہو؟''

امینہ نے برقعہ کا نقاب اٹھا کر چہرے پر مصنوعی غصہ لاتے ہوئے کہا ''بھائی جان! میں آپ سے بات نہیں کروں گی''

''ارے ارے! اتنا غصہ ٹھیک نہیں بھئی مجید! ہماری صلح کرا دو!''

امینہ نے اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر جھجکتے ہوئے کہا ''بھائی جان! آپ تو بھلا فوج میں تھے، اس لیے نہ آ سکے لیکن ان سے پوچھیے، یہ لاہور سے لائل پور نہیں پہنچ سکتے تھے؟ پہلے تو یہ امتحانوں کا بہانہ کرتے تھے لیکن اب کون سی مصروفیت تھی؟''

امینہ کے خاوند نے کہا"ہاں جی پہلے انہوں نے مجھے لکھا کہ ایم اے کا امتحان دینے کے بعد ضرور آؤں گا اس کے بعد لکھا کہ کتاب لکھ رہا ہوں اسے ختم کرنے کے بعد آؤں گا کتاب چھپ کر ہمارے پاس پہنچ گئی لیکن یہ نہ آئے ــــــ امینہ کہتی تھی کہ انہیں شکار کا شوق ہے اور میں ہر روز ان کے لیے بندوقیں صاف کیا کرتا تھا۔"

سلیم نے کہا"بھئی میں ابا جان کے پاس سیالکوٹ چلا گیا تھا وہاں سے انہوں نے کشمیر جانے کی اجازت دے دی۔ اب میں بالکل فارغ ہوں کسی دن ضرور آؤں گا اور جب تک میری بہن تنگ نہیں آجائے گی، وہیں رہوں گا۔"

ریلوے پلیٹ فارم سے مسافر خانے کی طرف کھلنے والے گیٹ پر ریلوے بابو کسی مسافر سے جھگڑ رہا تھا اور چند لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ مجید، سلیم کو امینہ اور اس کے خاوند کے ساتھ باتیں کرتا چھوڑ کر اس طرف چلا گیا۔ گیٹ کے قریب پہنچتے ہی اس نے ہنستے ہوئے مڑ کر دیکھا اور سلیم کو ہاتھ سے اشارہ کیا سلیم تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب پہنچا"کیا ہے یہاں؟"اس نے سوال کیا۔

مجید نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا"ارے ادھر دیکھو! چودھری رمضان بابو کے ساتھ جھگڑ رہا ہے۔"

سلیم نے چودھری رمضان کو بابو کے ساتھ گرما گرم بحث کرتے دیکھ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن مجید نے اسے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا"ارے ٹھہرو ذرا باتیں سننے دو"

بابو کہہ رہا تھا ''تم کو ساڑھے تین روپے دینے پڑیں گے میرے ساتھ زیادہ باتیں مت کرو۔''

چودھری رمضان نے جواب دیا ''واہ جی اگر تمہیں تین روپے دینے تھے تو میں ٹکٹ کیوں لیتا؟''

''ارے میں ٹکٹ کی بات نہیں کرتا تمہارے سامان کا وزن زیادہ ہے، میں اس کا کرایہ مانگتا ہوں۔''

رمضان نے جواب دیا ''خدا کی قسم! یہ تمام ہانڈیاں دوسروں کی ہیں میں نے اپنے گھر کے لیے صرف ایک خریدی تھی۔''

''مجھے اس سے کیا واسطہ کیا تم نے اپنے لیے ایک ہانڈی خیردی ہے، یا سب خریدی ہیں۔ یہ پوری تمہاری ہے اور اس میں جتنا سامان ہے، میں اس کا کرایہ تم سے وصول کروں گا۔''

''دیکھو بابو جی! میں نے ایک بار آپ سے کہا ہے کہ میں پسرور کے قریب اپنے رشتہ داروں کو ملنے گیا تھا۔ گاؤں کی عورتوں نے کہا کہ پسرور کی ہانڈیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ ہمارے لیے ضرور لیتے آنا۔ نجی، سنتی، ہرنام کور، بھاگو، تیلن، رحمت بی بی، ریشمے جولاہی اور پڑوس کی کئی عورتیں میرے گرد ہوگئیں۔ وہ مجھے پیسے دینا چاہتی تھیں لیکن میں نے سوچا، گاؤں کی مائیں بہنیں ہیں اگر ایک دو روپے خرچ بھی ہو گئے تو کوئی بات نہیں بابو جی! میں نے کوئی برا کام نہیں کیا آپ خود سوچیں، اگر آپ میرے گاؤں کے رہنے والے ہوں اور آپ کی ماں مجھے یہ کہے کہ چودھری رمضان!

میرے لیے پسرور سے ایک ہانڈی لے آنا تو مجھے انکار کرتے شرم نہ آئے گی؟''

''بس چپ رہو'' بابو نے گرج کر کہا ''کرایہ نکالو!''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ ہانڈیوں کا کرایہ ان کی قیمت سے تین گنا زیادہ ہوتا ہے؟''

''بس آج تمہیں معلوم ہو گیا نا آئندہ تم ایسی غلطی نہیں کرو گے''

''بابو جی! اگر تمہیں خدا نے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی توفیق نہیں دی تو دوسروں کو کیوں منع کرتے ہو؟''

''مذاق مت کرو میں ڈیوٹی پر کھڑا ہوں''

''مجھے کیا معلوم تھا کہ تم ڈیوٹی کے اوپر کھڑے ہو، ورنہ میں نہ لاتا یہ ہانڈیاں''

لوگ ہنس رہے تھے اور بابو کا پارہ چڑھ رہا تھا وہ چلایا ''زبان بند کرو اور پیسے نکالو''

رمضان نے اور زیادہ پریشان ہو کر کہا ''بابو جی! تم خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہو اگر میری بات پر یقین نہیں آتا تو ہانڈیوں کی بوری یہاں رکھ لو، گاؤں کی عورتیں خود لینے کے لیے آجائیں گی ان سے دو دو آنے لے لینا۔ تمہاری رقم پوری ہو جائے گی۔۔۔ ورنہ میرا ٹکٹ مجھے واپس دے دو۔ میں یہ ہانڈیاں پسرور چھوڑ آتا ہوں۔''

''تم کسی جنگل سے تو نہیں آئے؟''

''بابو جی! پسرور شہر ہے جنگل نہیں''

عمر رسیدہ اسٹیشن ماسٹر یہ تماشا دیکھ کر آگے بڑھا اور اس نے نرمی سے رمضان کو محکمہ ریلوے کے قواعد وضوابط سمجھانے کی کوشش کی۔

چودھری رمضان نے فریاد کے لہجے میں کہا "بابو خدا کی قسم! گاڑی میں اتنی بھیڑ تھی کہ میں سارا راستہ یہ بوری اپنی گود میں رکھ کر لایا ہوں۔ ہانڈیوں کی قیمت میں نے دی، ٹکٹ کے پیسے میں نے دیے۔ تکلیف میں نے اٹھائی، اب آپ ہی بتایئے اگر ساڑھے تین روپے اس بابو کو دے دوں تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"فائدہ یہ ہوگا کہ تم جیل نہیں جاؤ گے اور تمہاری عزت بچ جائے گی۔"

چودھری رمضان کچھ سوچ کر بولا "بابو جی میں نے کوئی چوری کی ہے جو جیل جاؤں گا؟ یہ لو ساڑھے تین روپے اور ایسی تیسی ان ہانڈیوں کی" اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ساڑھے تین روپے گن کر بابو کو دے دیے پھر جھک کر بوری کھولی اور ایک ہانڈی نکال کر فرش پر مارتے ہوئے بولا "یہ مائی فجی کی"

پھر اس نے دوسری اٹھا کر پھینکی اور کہا "یہ سنتی کی" اسی طرح اس نے یکے بعد دیگرے باقی ہانڈیاں توڑتے ہوئے کہا "یہ ہرنام کور کی، یہ بھاگو تیلن کی، یہ رحمت بی بی کی، یہ ریشمے جولاہی کی، یہ جلال کی ماں کی!"

جوں جوں ہانڈیاں کم ہو رہی تھیں اس کا جوش اور غصہ زیادہ ہو رہا تھا۔ سلیم، مجید اور دوسرے لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔ چودھری رمضان نے آخری ہانڈی اٹھائی تو اسے بروقت کسی کا نام یاد نہ آیا اس نے بابو کی طرف غضب ناک ہو کر دیکھا اور یہ "بابو کی ماں کی" کہتے ہوئے زمین پر دے ماری۔

بابو نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن سلیم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے پیچھے دھکیل دیا۔

بابو سلیم کو جانتا تھا، وہ بولا ''دیکھو جی! یہ گالیاں دیتا ہے۔ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔''

''رمضان بولا'' بابو جی! میں نے تم کو کونسی گالی دی ہے گالیاں تو ان کی سننے والی ہوں گی جن کی یہ ہانڈیاں تھیں مجھے افسوس ہے کہ آج شام بھاگو تیلن کی آواز تمہارے کانوں میں نہیں پہنچے گی ورنہ تم میری باتوں کو گالیاں نہ کہتے۔

سلیم نے اسٹیشن ماسٹر کو ایک طرف لے جا کر کہا ''وہ غریب آدمی ہے لیکن اگر میں اسے پیسے دوں تو وہ نہیں لے گا وہ میرے گاؤں کا ہے۔آپ اپنی طرف سے اسے یہ پیسے دے دیں''سلیم نے پانچ روپے کا نوٹ اسٹیشن ماسٹر کو دے دیا۔

چودھری رمضان اب از سر نو لوگوں کو اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔اسٹیشن ماسٹر نے اس کے قریب آ کر کہا ''بھئی چودھری! ناراض ہو کر نہ جاؤ، یہ لو پانچ روپے میں دیتا ہوں لیکن اب دوبارہ پسرور سے ہانڈیوں کی بوری لاؤ تو بک کروالینا۔''

''نہیں جی اپنے پیسے پاس رکھو، میں باز آیا ایسی نیکی سے۔''

''نہیں بھائی لے لو! ہم تمہیں جرمانہ اور ہانڈیوں کی قیمت واپس کرتے ہیں۔''

چودھری رمضان نے مجید اور سلیم کی طرف دیکھا اور ان کے اشارے سے نوٹ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اس کے بعد خالی بوری اپنے کندھے پر رکھ لی۔

مجید نے کہا ''چودھری! چلو ہمارے ساتھ تانگے پر چلو''

جب وہ تانگے پر سوار ہوئے تو رمضان کہہ رہا تھا ''بھئی! دنیا میں شرافت کی کوئی قدر نہیں وہ بابو جس کا نیولے کی طرح منہ ہے مجھے کہہ رہا تھا کہ میں یہاں ڈپٹی کے اوپر کھڑا ہوں جب تمہیں اور صوبے دار کو دیکھا تو بڑے بابو نے چپکے سے پانچ روپے نکال کر دے دیے۔''



مجید کی برات واپس آ چکی تھی گھر میں عورتیں دلہن کے گرد جمع تھیں مجید کی ماں، دادی اور چچیوں کو مبارک باد دی جا رہی تھی ایک معمر عورت نے مجید کی دادی سے پوچھا ''تحصیلدار کی ماں! سلیم کی شادی کب کرو گی؟''

''بہن! اگر میرے بس میں ہو تو آج ہی کر دوں لیکن علی اکبر کہتا ہے کہ اگر اسے کوئی ملازمت نہ ملی تو وکالت کے لیے تین سال اور پڑھنا پڑے گا اس لیے شادی ایک بوجھ ہو گا۔''

''ہے ہے! ساری عمر پڑھتا ہی رہے گا اس کے ساتھی تین تین بچوں کے باپ ہو گئے۔۔۔۔۔۔اور وہ تین سال اور پڑھے گا کہیں رشتہ تلاش کیا ہے؟''

''بہن! بہت رشتے آتے ہیں لیکن سلیم کی ماں کو ایک لڑکی پسند آ گئی ہے اور وہ کسی اور کا نام نہیں لینے دیتی دو سال ہوئے، اس کی ماں بھی آ کر کہہ گئی تھی کہ لڑکے کی منگنی کہیں نہ کرنا۔ کل علی اکبر کو ان کی طرف سے خط آیا تھا شاید اگلے مہینے وہ خود آئیں۔''

باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کا ہجوم تھا اور قریباً اسی قسم کے سوالات سلیم کے باپ اور دادا سے پوچھے جا رہے تھے۔ سلیم گھر سے کوئی چیز لینے آیا تو اس کی بہن زبیدہ نے اسے دیکھتے ہی دوسری لڑکیوں کو آواز دی ''امینہ، صغریٰ، حلیمہ، عائشہ بھائی جان آ گئے'' اور آن کی آن میں سلیم کی چچا زاد، خالہ زاد، پھوپھی زاد، اور ماموں زاد بہنوں نے اسے گھیر لیا۔ امینہ نے ابتدا کی ''بھائی جان! بھابی کب لاؤ گے؟''

''کون سی بھابی؟ چڑیل چپ رہو، نہیں تو مار کھاؤ گی''

امینہ نے ہنس کر کہا ''دیکھو بھائی جان! مجھے مار لو لیکن بھابی ضرور لاؤ''

لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا سلیم انہیں اپنے راستے سے ہٹاتا ہوا باہر نکلا۔ صحن میں اس کی ماں نے کہا ''سلیم مجھے یاد نہیں رہا، تمہارے دو خط آئے ہوئے ہیں، میں نے تمہاری میز کی دراز میں رکھ دیے تھے۔''

سلیم نے جلدی سے اندر جا کر میز کی دراز سے خط نکالے۔ ایک مختصر سا خط اختر کی طرف سے تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ میں رضاکاروں کی جماعت کے ساتھ بہار جا رہا ہوں اگر تم جانا چاہو تو دو چار دن میں لاہور پہنچ جاؤ۔

دوسرا خط ناصر کی طرف سے تھا اور یہ کسی قدر طویل تھا سلیم نے جلدی سے آخری صفحہ الٹ کر لکھنے والے کا نام دیکھا اور اسے اطمینان کے ساتھ پڑھنے کی نیت سے باہر نکل آیا باہر کی حویلی میں سائبان کے نیچے آدمیوں کی محفل گرم تھی، اس لیے وہ بیٹھک میں چلا گیا۔ ناصر علی کے خط کا مضمون یہ تھا:

میرے پاکستانی بھائی!

میں یہ خط کلکتہ کے ایک ہسپتال سے لکھ رہا ہوں بہار میں آگ اور خون کے طوفان سے گزرنے کے بعد میں یہاں پہنچا ہوں جو کچھ میں نے دیکھا ہے، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ اگر بیان کر بھی سکوں تو تمہیں یقین نہیں آئے گا تمہیں یہ کیسے یقین آئے گا کہ دو ہزار انسانوں کی ایک بستی جہاں ایک صبح زندگی کی مسکراہٹیں بیدار ہو رہی تھیں، شام تک راکھ کا ایک انبار بن چکی تھی جہاں سورج کی ابتدائی کرنوں نے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسانوں کو دیکھا تھا، وہاں آفتاب کی واپسیں نگاہیں بے گور وکفن لاشیں دیکھ رہی تھیں۔ سلیم! یہ میرا گاؤں تھا اور یہ صوبہ بہار کی ان سینکڑوں بستیوں میں سے ایک تھا جہاں بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور مردوں نے اہنسا اور شانتی کے علمبرداروں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے کان، ناک، ہاتھ اور دوسرے اعضا کاٹ کر ہماری مسجد کی سیڑھیوں پر سجائے گئے۔ بچوں کو نیزوں پر اچھالا گیا۔ نوجوان لڑکیوں کی عصمت اور عفت کی دھجیاں اڑائی گئیں اور باپ اور بھائیوں کو بنوک سنگین مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی ذلت اور رسوائی کا تماشا دیکھیں۔

تم شاید ہمیں بزدلی اور بے غیرتی کا طعنہ دو لیکن یقین کرو کہ یہ وہ طوفان ہے جس کے لیے ہم قطعاً تیار نہ تھے کانگرسی حکومت ہم پر

بھیڑیے چھوڑنے سے پہلے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ چکی تھی۔ وہ پولیس جو ہمارے گھروں کی تلاشیاں لے کر چھوٹے چاقو تک ضبط کر چکی تھی، ہندوؤں کو بندوقوں اور پستولوں سے مسلح کر چکی تھی۔ حکومت ان کی تھی قانون ان کا تھا۔ پولیس ان کی تھی اسلحہ اور بارود ان کا تھا۔۔۔ہم کب تک لڑتے اور کہاں تک مقابلہ کرتے؟ وہ خالی ہاتھ جو مدافعت کے لیے اٹھے، کٹ کر رہ گئے، وہ سینے جن میں غیرت اور ایمان تھا گولیوں سے چھلنی ہو گئے۔ میرے گاؤں کے پانچ سو نوجوانوں نے لاٹھیوں کے ساتھ چار گھنٹے ان بلوائیوں کا مقابلہ کیا جو تعداد میں ان سے آٹھ دس گنا زیادہ تھے جن میں سے بعض بندوقوں اور پستولوں اور باقی تلواروں اور نیزوں سے مسلح تھے اور ہم نے انہیں بھگا دیا۔۔۔وہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ آئے تو ان کی تعداد دس ہزر تھی اور پولیس کی سنگینیں ان کی رہنمائی کر رہی تھیں۔۔۔۔۔ انہیں فتح ہوئی لیکن کیا یہ ہماری شکست تھی؟۔۔۔اگر گولیوں کی بارش میں پانچ سو نوجوان دس ہزار حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے ختم ہو جائیں اور ان کے بعد بچوں اور بوڑھوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور بستی کو آگ لگا دی جائے تو کیا اسے مدافعت کرنے والوں کی شکست کہا جائے گا؟ اور پھر اگر کسی بوڑھے باپ کو درخت کے ساتھ باندھ دیا جائے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وحشت اور بربریت کے ہاتھوں

میں اس کی نوجوان بیٹیاں تڑپنے، چیخنے اور چلانے کے بعد ختم ہو جائیں اور پھر ان کی لاشوں کے ساتھ بھی ۔۔۔۔ سلیم! میں نے یہ سب کچھ دیکھا ہے انہوں نے مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا میں حیران ہوں کہ میں اب تک زندہ کیوں ہوں سورج اب تک کیوں طلوع ہوتا ہے۔ ستارے اب تک کیوں چمکتے ہیں؟

یہ خط میں نے تمہیں اس لیے نہیں لکھا کہ تم میرے خاندان اور میرے گاؤں کی تباہی پر اظہار افسوس کرو۔ بہار میں ایک خاندان یا ایک بستی تباہ نہیں ہوئی، اب تک قریباً ساٹھ ہزار انسان مارے جا چکے ہیں اور چار لاکھ بے خانماں ہو چکے ہیں لیکن اس قدر تباہی اور بربادی کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی بہت کچھ دیکھنا ہے۔ ابھی ہندو فاشزم اپنی تمام تخریبی قوتوں کے ساتھ میدان میں نہیں آیا۔ بہار میں ابھی چھوٹے پیانے پر ایک تجربہ کیا گیا ہے، ابھی تک وہ خنجر جو عدم تشدد کی آستینوں میں چھپے ہوئے ہیں، پوری طرح ظاہر نہیں ہوئے ہندو آتشیں پہاڑ سے صرف چند چنگاریاں نکلی ہیں اب بھی وقت ہے کہ مسلمان ہوشیار ہو جائیں بالخصوص اکثریت کے صوبوں کے مسلمان جن کی قوت مدافعت کے ساتھ اقلیت کے صوبوں کے مسلمان اپنی زندگی اور بقا کی امیدیں وابستہ کر چکے ہیں اگر ہمارے لیے نہیں تو کم از کم اپنی بقا کی جنگ کے لیے ہی پنجاب کے

مسلمانوں کو تیار کرو۔۔۔اگر بہار کے واقعات کے بعد بھی آپ لوگوں کی آنکھ نہ کھلی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم زندہ رہنے کے مستحق نہیں۔

ہمارے لیڈروں کی یہ حالت ہے کہ وہ ابھی تک قوم کے ہر درد کے علاج کے لیے اپنا تازہ بیان کافی سمجھتے ہیں وہ دنیا کو یہ بتا دینا ہی کافی سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہندو کیا کر رہا ہے۔اس نے اتنے گھر جلا ڈالے، اتنے آدمیوں کو مار ڈالا۔۔۔۔دفاعی کمیٹی بنی اس کے بعد مجلس عمل بنی، لیکن ان کی تمام سرگرمیاں بیان بازی تک محدود ہیں خدا کے لیے قوم کے نوجوانوں کو بیدار کرو۔پانی اب سر کے برابر آچکا ہے۔

میرے زخم ٹھیک ہو چکے ہیں اور پانچ چھ روز تک میں رضا کاروں کے ایک وفد کے ساتھ بہار جا رہا ہوں

تمہارا مخلص

ناصر علی

خط پڑھنے کے بعد سلیم بے حس وحرکت کرسی پر بیٹھا رہا۔بیٹھک سے باہر اسے مردوں اور عورتوں کے قہقہے ناخوش گوار محسوس ہو رہے تھے۔یوسف ہانپتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا ''بھائی جان! میں آپ کو کتنی دیر سے ڈھونڈ رہا ہوں، آپ کے دوست آئے ہیں۔''

''کون؟''سلیم نے سوال کیا

’’مہندر سنگھ‘‘

’’اچھا! انہیں یہاں لے آؤ!‘‘

یوسف بھاگتا ہوا باہر نکل گیا اور تھوڑی دیر میں مہندر سنگھ بیٹھک میں داخل ہوا۔ سلیم نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور اسے اپنے قریب کرسی پر بٹھالیا۔ مہندر سنگھ نے کہا ’’میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں کل بلونت سنگھ کو آنا تھا اس لیے میں مجید کی برات میں شریک نہ ہو سکا۔‘‘

’’آ گیا وہ؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘

’’اسے یہاں کیوں نہیں لائے۔ اس سے ملے بہت عرصہ ہو گیا ہے!‘‘

’’وہ آج صبح اپنی سسرال چلا گیا تھا۔ کل یا پرسوں وہ آپ کے پاس آئے گا۔‘‘

’’ابھی تک وہ کشمیر کی فوج میں ہے نا؟‘‘

’’جی ہاں! اب تو وہ کہتا ہے کہ میں بہت جلد کیپٹن بننے والا ہوں۔‘‘

سلیم نے سوچ کر کہا ’’مہندر چائے پیو گے؟‘‘

’’نہیں چائے تو میں پی کر آیا ہوں۔ میں آپ کو یہ کہنے آیا تھا کہ پرسوں اگر آپ کو فرصت ہو تو شکار کو چلیں۔‘‘

''پرسوں تک شاید میں یہاں نہیں رہوں گا۔''

''کہاں جا رہے ہیں آپ؟''

''میں بہت دور جا رہا ہوں!''

''آپ کچھ پریشان ہیں؟''

سلیم نے کچھ دیر پریشان رہنے کے بعد کہا ''مہندر! الیکشن کے دنوں میں علی گڑھ یونیورسٹی کا ایک طالب علم یہاں آیا ہوا تھا میں نے اس کے ساتھ تمہاری ملاقات بھی کرائی تھی۔''

''ہاں! مجھے ابھی تک وہ غزل یاد ہے جو اس نے یہاں سنائی تھی۔ بہت اچھی آواز تھی اس کی۔''

''وہ بہار کا رہنے والا تھا۔''

مہندر نے قدرے مضطرب ہو کر کہا ''اس کے متعلق کوئی بری خبر آئی ہے؟''

''اس کا خط آیا ہے''

''بہار کے متعلق بڑی افسوسناک خبریں آ رہی ہیں کیا لکھتا ہے وہ؟''

''یہ اس کا خط ہے۔۔۔۔۔'' سلیم نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا ''تم اسے پڑھ سکتے ہو''

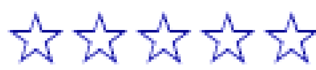
خط پڑھنے کے بعد مہندر کچھ دیر سلیم کی طرف دیکھتا رہا بالآخر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا ''تو آپ بہار جا رہے ہیں؟''

''ہاں!''

''کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔۔۔۔۔کاش مجھ جیسے ایک آدمی کی قربانی تباہی و ہلاکت کے اس طوفان کو روک سکتی۔۔۔۔میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ طوفان کسی دن یہاں بھی آئے گا۔۔۔۔ہندو فاشزم انسانیت کو ختم کرنے کے لیے جو چتا تیار کر رہا ہے، پنجاب میں میری قوم اس کا ایندھن بنے گی۔۔۔۔۔بھائی سلیم! اس آگ کو یہاں آنے سے روکیے۔۔۔۔۔ورنہ پانچ دریا کسی دن سرخ ہو جائیں گے۔۔۔۔۔لیکن نہیں آپ اسے نہیں روک سکتے۔۔۔۔۔اسے کوئی نہیں روک سکتا۔میری قوم ان فاشسٹوں کو اپنے گوردوارے استعمال کرنے کی اجازت دے چکی ہے۔سکھ مسلمانوں کا گھر جلانے کے شوق میں اپنے گھر بھی جلا ڈالیں گے اور ہندو آگ اور تیل مہیا کرنے کے بعد مزے سے تماشا دیکھے گا۔۔۔۔۔''

سلیم نے کہا ''مہندر! جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں، میں پنجاب کا مستقبل اس قدر ہولناک نہیں سمجھتا۔''

اس وقت مجھ جیسے لوگوں کی آواز نہیں سنے گا۔اس وقت ایسی آواز نکالنے والے آدمی کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔۔۔۔۔



آگ پھیلتی گئی۔بمبئی اور بہار میں انسانیت کا دامن نوچنے والے ہاتھ یو پی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ہندو اکثریت کے صوبوں میں غنڈوں اور بلوائیوں کی جو افواج منظم ہو رہی تھیں، انہیں کانگرسی وزارتوں کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی

لیکن پنجاب اور سرحد کی وزارتوں نے مسلمان کے بازوئے شمشیر زن کو اپنی مصلحتوں کی بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔

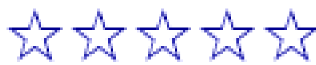
پنجاب کے ملت فروش نے اپنے ہندو سرپرستوں کو اور زیادہ مطمئن کرنے کے لیے مسلم لیگ کے رضا کاروں کی جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا بظاہر یہ حکم پنجاب کو پرامن رکھنے کے لیے دیا گیا تھا لیکن اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی رہی سہی قوت مدافعت کچل کر بھارت کے بھیڑیوں کے لیے میدان صاف کیا جائے۔ اس اقدام کو غیر جانب دارانہ رنگ دینے کے لیے مہا سبھا کے سیوادل وغیرہ پر بھی پابندیاں عاید کر دی گئیں لیکن کانگرس کے رضا کاروں کو پوری آزادی تھی دوسرے الفاظ میں مہا سبھائی رضا کاروں کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے فقط اپنے سائن بورڈ بدل دینے کی ضرورت تھی اس حکم کا عملی نفاذ فقط مسلمانوں تک محدود تھا۔

پنجاب کے مسلمان اس وزارت کا تختہ الٹنے پر مجبور ہو گئے جس نے ان کی اکثریت کے صوبہ میں بھی ان پر اقلیت کو مسلط کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کے دفاتر کی تلاشیاں شروع ہوئیں۔ چند لیڈر گرفتار ہوئے دوسروں نے نیک نامی میں حصہ دار بننے کے لیے ان کی تقلید کی۔ چنانچہ چند دن میں ملت کے وہ اکابر جو معمولی غصے کی حالت میں قدرے نرم اور زیادہ غصے کی حالت میں قدرے گرم بیان دے کر ملت کے تمام دکھوں کا علاج کر دیا کرتے تھے، ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سرپٹ دوڑتے ہوئے جیلوں میں جا پہنچے۔ ان میں سے کئی بزرگ ایسے تھے جنہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر وہ ایک دن لیٹ جیل پہنچے تو شاید لیڈروں کی پچھلی صف میں دھکیل

دیے جائیں۔

بظاہر یہ تحریک عمر رسیدہ لیڈروں کی رہنمائی سے محروم ہو چکی تھی لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ قیادت متوسط درجہ کے باعمل نوجوانوں کے ہاتھ میں آ گئی اور یہ تحریک عوامی تحریک بن گئی۔قوم خضر حیات خاں اور ان کے سرپرستوں کا چیلنج قبول کر چکی تھی۔ قوم کے فرزند،قوم کی بیٹیاں اور قوم کی مائیں میدان میں آ چکی تھیں۔ باہمت مسلم نوجوان ملت فروشوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر چکے تھے جیلیں بھر چکی تھیں، پولیس کی لاٹھیاں ٹوٹ چکی تھیں اشک آور گیس کے بم ناکارہ ہو چکے تھے مسلم اخبارات بند تھے لیکن پنجاب میں کوئی گاؤں ایسا نہیں تھا جہاں پولیس کی تمام کوششوں کے باوجود خفیہ تحریک کی طرف سے ہدایات نہیں پہنچتی تھیں خضر اور سچر کے قانون کے مطابق ایک جگہ چار مسلمانوں کا جمع ہونا جرم تھا لیکن کوئی قصبہ ایسا نہیں تھا جہاں ہزاروں انسانوں کا جلوس نہیں نکلتا تھا پنجاب کا ملت فروش یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے اپنی قوم کو مردہ سمجھ کر ہندو کے ساتھ اس کی عزت اور آزادی کا سودا کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔

یہی حال صوبہ سرحد کا تھا۔۔۔۔۔۔کانگرس نے درہ خیبر پر رام راج کا جھنڈا گاڑنے کی نیت سے جس شتر بے مہار پر سواری کی تھی، وہ دلدل میں پھنس چکا تھا۔۔۔پٹھان کی نگاہوں میں چرخے کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔



گورداسپور کی طرف سے آنے والی ایک لاری امرتسر کے اڈے پر آ کر رکی۔ سلیم اور اس کے ساتھ ایک اور نوجوان جلدی سے اتر کر پاس ہی ایک دکان سے لسی پی رہے تھے کہ کسی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''چودھری جی! السلام علیکم''

سلیم نے مڑ کر اس کے سلام کا جواب دیا لیکن وہ اسے پہچان نہ سکا۔ ''آج کدھر چڑھائی کی ہے؟''

سلیم اب محسوس کر رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کہیں پہلے بھی دیکھ چکا ہے۔اس نے جواب دیا ''میں لاہور جا رہا ہوں۔''

''اور میاں محمد صدیق بھی لاہور جا رہے ہیں؟'' اس نے سلیم کے ساتھی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''نہیں جی میں سیالکوٹ جا رہا ہوں'' سلیم کے ساتھی نے جواب دیا۔

''بتائیے! میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں؟''

سلیم کے ساتھی نے جواب دیا ''نہیں آپ کی بڑی مہربانی''

پاس ہی سڑک کے دوسرے کنارے امرت سر سے لاہور جانے والی بس کا کلینر پکار رہا تھا ''چلو بھئی لاہور۔۔۔۔۔موٹر تیار ہے'' اور سلیم اور صدیق اس آدمی کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد موٹر پر سوار ہو گئے۔

جب موٹر چل پڑی تو سلیم نے اپنے ساتھی سے پوچھا ''صدیق! یہ کون تھا۔۔۔۔۔؟''

''یہ کریم بخش حوالدار ہے آپ بھول گئے الیکشن کے دنوں میں اس نے آپ سے تھوڑا سا جھگڑا کیا تھا۔''

''ارے یار! میں پہچان نہیں سکا۔ اصل میں یہ وردی کے بغیر تھا۔''

صدیق نے کہا ''یہ تبدیل ہو کر امرتسر آ گیا ہے میرے خیال میں اب یہ سی، آئی، ڈی میں ہے۔''

''بھئی! یوں بھی تو خضر کی پولیس آج کل سفید کپڑوں میں ڈیوٹی دینا زیادہ آسان سمجھتی ہے۔ وہ ہمیں بڑی مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔''

لاہور پہنچ کر سلیم نے صدیق سے کہا ''تم یہیں اڈے پر رہو۔ میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد سلیم شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا ایک مسجد کے ساتھ پان فروش کی دکان پر رکا۔ اس نے دکاندار کو غور سے دیکھنے کے بعد سوال کیا۔ ''کیوں جی نرگس کے پھول کہاں ملیں گے؟''

دکاندار نے سر سے لے کر پاؤں تک چند بار اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بولا'' میرے ساتھ آئیے!''

سلیم اس کے پیچھے چل دیا۔ دکاندار گلی کے موڑ پر ایک مکان کے بند دروازے کی طرف اشارہ کر کے واپس چلا گیا۔ سلیم نے تھوڑے وقفے کے بعد پانچ مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کسی نے اندر سے آواز دی۔ ''کون ہے؟''

سلیم نے کہا ''مکان نمبر اکیس یہی ہے؟''

ایک نوجوان نے دروازہ کھولتے ہوئے باہر جھانکا اور سلیم سے پھر سوال کیا ” آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”اختر صاحب یہاں ہیں؟“

”نہیں! وہ کہیں جا چکے ہیں آپ کا نام سلیم ہے؟“

”جی ہاں! مجھے دس بجے سے پہلے یہاں پہنچنا تھا لیکن موٹر نہ مل سکی۔“

”آپ اندر آجایئے!“

سلیم اندر داخل ہوا تو نوجوان نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا ” آپ کی چیز ہمارے پاس موجود ہے، آیئے!“

سلیم اس کے پیچھے ڈیوڑھی سے گزرنے کے بعد ایک کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک کونے میں پانچ لڑکے ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے سلیم نے اپنی جیب سے چند کاغذات میز پر رکھتے ہوئے کہا ” میں پمفلٹ کے لیے یہ مضمون لکھ کر لایا ہوں۔ اختر صاحب کب واپس آئیں گے؟“

ایک نوجوان نے جو بظاہر اس گروہ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، جواب دیا:

”ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ آپ کے پمفلٹ کے متعلق وہ ہمیں ہدایت دے گئے ہیں اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ آپ کو ایک سائیکلو اسٹائل مشین دے دی جائے۔ میں حیران ہوں کہ آپ کی مقامی لیگ کے پاس ایک سائیکلو اسٹائل مشین بھی نہیں ہے؟“

”بھئی! ہماری لیگ کے دفتر میں ایک ٹوٹا ہوا حقہ تھا، اب وہ بھی شاید پولیس اٹھا

کر لے گئی ہے۔''

''اچھا سلیم صاحب! آپ ہمارے ساتھ کچھ کام کرائیں گے یا جانا چاہتے ہیں؟''

''مجھے آپ حکم دے سکتے ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ میں آج رات واپس پہنچ جاؤں۔ ہمارے علاقے میں پروپیگنڈے کا کوئی انتظام نہیں۔''

دس گیارہ سال کی ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی، اور اس نے کہا ''ہم نے بیس ہزار اشتہار چھاپ دیے ہیں۔ بڑی آپا کہتی ہیں، بلیٹن کا مضمون دیجیے اور کاغذ کا انتظام بھی کیجیے۔''

لڑکی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور نوجوان نے سلیم کی طرف متوجہ کر کہا:

بھئی! ہماری بہنوں نے بہت کام کیا ہے۔ یہ ہمیں ایک لمحہ بیکار نہیں بیٹھنے دیتیں۔ اچھا ہوا آپ کا پمفلٹ آ گیا۔ ہم انہیں چند گھنٹے اور مصروف رکھ سکیں گے۔۔۔۔ اچھا آپ جائیں۔ اصغر وہ سوٹ کیس سلیم صاحب کو دے دو لیکن بھائی ذرا احتیاط کرنا۔ آج کل پولیس ان چیزوں کو بم سے زیادہ خطرناک سمجھتی ہے۔ اگر پکڑے جاؤ تو پولیس والوں کو اس جگہ کا پتہ نہ دینا۔ اگر کہو تو تمہارے ساتھ امرتسر تک کسی کو بھیج دیں۔

سلیم نے کہا ''میرے ساتھ ایک آدمی ہے، میں اسے اڈے پر چھوڑ آیا ہوں۔''



شام کے پانچ بجے سلیم اور اس کا ساتھی موٹر پر دوبارہ امرتسر پہنچے تو کریم بخش حلوائی کی دکان کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔ موٹر سے اترتے وقت صدیق کی نگاہ اچانک اس پر جاپڑی اور اس نے سلیم سے کہا ''ارے یار وہ بدمعاش ابھی تک یہاں ہے۔''

''کون؟''

کریم بخش اس نے مجھے دیکھ لیا ہے۔

سلیم نے کہا ''دیکھو صدیق، اگر معاملہ خراب ہو گیا تو میں اس کے ساتھ نپٹنے کی کوشش کروں گا۔ تمہیں اگر سوٹ کیس لے کر بھاگنے کا موقع مل جائے تو میری پروا نہ کرنا۔ امرتسر میں کسی کو جانتے ہو؟''

''میرے یہاں کئی رشتہ دار ہیں۔''

اتنی دیر میں کریم بخش دوکان سے اٹھ کر ان کے قریب آچکا تھا ''چودھری جی! بہت جلد آگئے آپ لاہور سے؟'' اس نے آتے ہی کہا۔

''جی ہاں! مجھے وہاں کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔''

''آج رات میرے پاس ٹھہریں۔''

''مہربانی! لیکن مجھے گھر میں بہت ضروری کام ہے۔''

''کوئی جلسہ ولسہ ہوگا؟''

''ہاں! جلسے بھی تو ہوتے رہتے ہیں اچھا خدا حافظ! اب دیر ہو رہی ہے۔ کہیں گورداسپور کی موٹر نہ نکل جائے۔''

”موٹریں بہت آپ فکر نہ کریں میاں محمد صدیق، آپ کو تو شاید سیالکوٹ جانا تھا؟“

صدیق کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایک غلطی کر چکا ہے۔

اس نے گھبرا کر جواب دیا ”بس جی! میں بھی ان کے ساتھ ہی واپس آ گیا۔“

کریم بخش نے سلیم سے کہا ”صبح شاید آپ کے پاس یہ سوٹ کیس نہیں تھا؟“

سلیم نے جواب دیا ”نہیں، میرا سامان لاہور میں پڑا ہوا تھا۔ صدیق چلو! دیر ہو رہی ہے۔ اچھا حوالدار صاحب! السلام علیکم!“

حوالدار نے کہا ”اس اڈے پر تو کوئی لاری نہیں ہے۔ دوسرے اڈے پر آپ کو لاری مل جائے گی۔ چلئے میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں ۔۔۔۔۔ لائیے! میں اٹھا لیتا ہوں آپ کا سوٹ کیس۔“

”نہیں! مہربانی، یہ بھاری نہیں ہے۔“

صدیق نے کہا ”لائیے میں اٹھا لیتا ہوں“

سلیم نے سوٹ کیس صدیق کے ہاتھ میں دے دیا۔ پولیس کا ایک سپاہی سڑک پر لاٹھی لیے کھڑا تھا۔ کریم بخش نے چلتے چلتے مڑ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کیا اور وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔ سلیم اس کی یہ حرکت دیکھ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے سامنے سڑک پر جانے والے کسی آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”ارے صدیق! وہ منور جا رہا ہے، بلاؤ اس گدھے کو“ اور صدیق ”منور! منور! ارے منور کے بچے!!“ کہتا ہوا تیزی سے آگے چل دیا۔ آن کی آن میں صدیق کوئی تیس قدم آگے جا چکا

تھا۔

حوالدار اور کانسٹیبل پریشانی کی حالت میں سلیم کے قریب کھڑے تھے اچانک کریم بخش سلیم کا بازو پکڑ کر چلایا ''گنڈا سنگھ، بھاگو اس سوٹ کیس والے کا پیچھا کرو۔ دیکھو وہ بھاگ رہا ہے۔ سیٹی بجاؤ!''

گنڈا سنگھ سیٹی بجاتا اور لاٹھی ہلاتا ہوا بھاگا لیکن صدیق کی رفتار اس سے بہت تیز تھی۔ رائے عامہ پولیس کے متعلق پیدا ہو چکی تھی۔ ایک ہٹے کٹے نوجوان نے اچانک اپنی ٹانگ آگے کر دی اور گنڈا سنگھ ''تیری ماں۔۔۔۔۔۔'' کہہ کر منہ کے بل گر پڑا۔۔۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو کر قہقہے لگا رہے تھے۔

وہ غضب ناک ہو کر اٹھا۔ سوٹ کیس والے مجرم سے زیادہ اسے ٹانگ پھنسانے والے کی تلاش تھی۔

''کیا ہوا سنتری جی؟'' ایک عمر رسیدہ بنیے نے آگے بڑھ کر سوال کیا اور گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر انتہائی بے تکلفی کے ساتھ اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

اتنی دیر میں کریم بخش بھی سلیم کا بازو پکڑے ہوئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ چلایا ''گنڈا سنگھ بھاگو اس کا پیچھا کرو۔''

گنڈا سنگھ دوبارہ بھاگا لیکن اب اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے۔'' صدیق سامنے مظاہرین کے ایک جلوس میں غائب ہو چکا تھا۔''

دو اور کانسٹیبل کریم بخش کے پاس پہنچ چکے تھے، اور وہ انتہائی غضبناک لہجے میں سلیم سے کہہ رہا تھا ''بابو جی! بتاؤ اس سوٹ کیس میں کیا تھا اور اسے کہاں بھیجا ہے تم

نے؟“

سلیم نے بے پروائی سے جواب دیا”تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو تم ہو کون؟“

ایک سپاہی نے کہا”حوالدار صاحب کے ساتھ ہوش سے بات کرو“

”اچھا یہ حوالدار صاحب ہیں؟“

کریم بخش چلایا” لے چلو اسے تھانے میں اس کے پاس بم تھے۔“



پولیس کی مار پیٹ کے بعد سلیم حوالات میں منہ کے بل پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ تھانیدار اپنے علاقے میں گشت کرنے کے بعد رات کے آٹھ بجے واپس آیا اور دو سپاہی سلیم کو حوالات سے نکال کر اس کے سامنے لے گئے۔

سلیم کو تھانیدار کی میز کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔ سلیم کے دانتوں اور ناک سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ تھانیدار نے تھوڑی دیر میز پر پڑے ہوئے کاغذات الٹ پلٹ کرنے کے بعد سلیم کی طرف دیکھا۔ دونوں پہلی نگاہ میں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ سب انسپکٹر منصور علی کالج میں اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ندامت، پریشانی اور اضطراب کی حالت میں سلیم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سلیم کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ چند سیکنڈ قریب پڑی ہوئی کرسی کا سہارا لینے کے بعد فرش پر گر کر بیہوش ہو گیا۔ تھانیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”یہ مکر کرتا ہے جی!“ ایک سپاہی نے اسے ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

تھانیدار نے آگے بڑھ کر اسے ایک ہاتھ سے دھکا دیا اور سپاہی دہلیز کے پاس جا گرا اور پھر اس نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا ''گنڈا سنگھ! اس کی پیٹی اتار لو۔ میراں بخش! اس کے لیے پانی لاؤ!''

تھوڑی دیر بعد سلیم کو ہوش آ چکا تھا۔ تھانیدار کے حکم سے سپاہیوں نے اسے برآمدے میں چارپائی پر لٹا دیا۔

وہ سپاہی جس نے ٹھوکر ماری تھی، پریشانی، اور گنڈا سنگھ جسے اس کی پیٹی اتارنے کا حکم ملا تھا، تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔

تھانیدار نے دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''اسے کس نے مارا ہے؟''

سپاہی گنڈا سنگھ اور میراں بخش کی طرف دیکھنے لگے۔

گنڈا سنگھ بولا ''جی اس کے پاس بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس تھا، ہم نے حوالدار صاحب کے حکم سے اسے مارا ہے۔''

''اچھا۔ وہ بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کہاں ہے؟''

''جی اسے ایک اور آدمی لے کر بھاگ گیا ہے۔''

''سوٹ کیس والا بھاگ گیا اور جو خالی ہاتھ تھا، تم اسے پکڑ کر یہاں لے آئے یہی بات ہے نا؟''

''جی ہاں!''

''شاباش! تم بہت سمجھدار آدمی ہو، لیکن اسے پکڑ کر کیوں نہ لائے جس کے پاس بم تھے، وہ کہاں ہے؟''

''جی اسی کے متعلق تو ہم پوچھ رہے تھے اس سے یہ تین دفعہ بیہوش ہوا ہے لیکن نہیں بتاتا کہ وہ سوٹ کیس والا کہاں گیا ہے؟''

تھانیدار چلایا ''لیکن تم نے اسے کیوں نہیں پکڑا، اپنے اس باپ کو کیوں پکڑ کر لائے؟''

''جی میں گر پڑا تھا اور وہ بھاگ گیا تھا۔''

''تم نے اس کا سوٹ کیس دیکھا تھا؟''

''جی دیکھا تو تھا''

''کیا رنگ تھا اس کا؟''

''شاید سبز تھا''

''تم نے بم دیکھے تھے؟''

''جی نہیں، حوالدار صاحب نے دیکھے ہوں گے''

''تھانیدار نے گرج کر کہا'' حوالدار کہاں ہے؟

''جی وہ ابھی تھک کر گئے ہیں''

''کیسے تھک گیا وہ؟''

''جی ملزم کو پیٹ کر۔ وہ کہتے تھے میں تھک گیا ہوں، ابھی کھانا کھا کر آتا ہوں۔''

حوالدار داخل ہوا۔ اور اس نے آتے ہی کہا ''جی مجھے بلایا ہے؟''

''ہاں! تم نے کوتوالی میں مجھے ٹیلی فون کیا تھا کہ تم نے کہیں بم دیکھے ہیں، کہاں

ہیں وہ؟''

''جی وہ سوٹ کیس لے کر بھاگ گیا ہے، یہ اس کا ساتھی ہے۔میں اسے جانتا ہوں''

''اور تم نے سوٹ کیس میں بم دیکھے تھے؟''

''نہیں! مجھے شک ہے بلکہ یقین ہے یہ صبح لاہور گئے تھے اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئے۔''

تھانیدار نے بات کاٹ کر کہا''کیوں گنڈا سنگھ امرت سر اور لاہور کے درمیان صبح سے شام تک کتنے آدمی سفر کرتے ہیں؟''

''جی ہزاروں''

''اچھا یہ بتاؤ، وہ سب بموں کا کاروبار کرتے ہے؟''

''جی نہیں''

حوالدار نے کہا''جی ان کے پاس سوٹ کیس تھا صبح جب وہ گئے تھے۔۔۔تو۔۔۔''

تھانیدار نے پھر اس کی بات کاٹ دی''اچھا یہ بات ہے کیوں گنڈا سنگھ! اگر امرتسر اور لاہور کے درمیان سفر کرنے والے کسی آدمی کے ہاتھ میں سوٹ کیس دیکھو تو تم اسے گولی مار دو گے؟''

گنڈا سنگھ نے گھبرا کر کہا''جی وہ کیوں؟''

''کیونکہ تمہارے حوالدار کا خیال ہے کہ سوٹ کیس میں بموں کے سوا کچھ نہیں

ہوتا۔‘‘

’’جی اگر حوالدار صاحب حکم دیں تو پھر مجھے گولی چلانی پڑے گی، ورنہ ہر سوٹ کیس میں بم تو نہیں ہوتے۔‘‘

کریم بخش نے کہا ’’جی! میں آپ کو سارا واقعہ سناتا ہوں‘‘

تھانیدار نے گرج کر کہا ’’میں کچھ نہیں سنتا تم نے ایک شخص کو بموں سے بھرا ہوا سوٹ کیس اٹھا کر بھاگنے کا موقع دیا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو تم پرلے درجے کے بیوقوف ہو کہ اسے چھوڑ کر دوسرا آدمی پکڑ لائے۔ اگر یہ غلط ہے اور اس شخص کو تم نے بلا وجہ مارا ہے تو بھی میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ ایس، پی شاید یہ بات برداشت نہ کرے کہ امرتسر میں کوئی شخص بموں کا ایک سوٹ کیس بھر کر لایا ہے اور دو آدمی اسے پکڑ نہیں سکے۔ تم گنڈا سنگھ کو لے جاؤ اور اسے پکڑ کر لاؤ اور میں ایس پی کو ٹیلی فون کرتا ہوں کہ وہ تمہارے لیے انعام تیار رکھے۔‘‘

کریم بخش ملتجی ہو کر بولا ’’خان صاحب! ہو سکتا ہے کہ میں نے غلطی کی ہو لیکن میں انہیں جانتا ہوں، یہ اور اس کا ساتھی دونوں سخت لیگی ہیں ــــــ الیکشن کے دنوں میں ــــــ ‘‘

تھانیدار نے کہا ’’کیوں گنڈا سنگھ، آج شہر میں کتنے مسلم لیگیوں کا جلوس نکلا ہے؟‘‘

’’وہ پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھے‘‘

’’اپنے حوالدار سے کہو، ان سب پر بم رکھنے کے جرم میں مقدمہ چلائے‘‘

’’ہاں کریم بخش! اس سوٹ کیس کا رنگ کیا تھا؟‘‘

’’جی سیاہ تھا‘‘

’’کیوں گنڈا سنگھ کیا رنگ تھا اس کا؟‘‘

گنڈا سنگھ تھانیدار کے تیور دیکھ چکا تھا، وہ بولا ’’جی میں نے جو سوٹ کیس دیکھا تھا، وہ تو شاید سبز تھا۔‘‘

کریم بخش نے بدحواس ہو کر کہا ’’خدا کی قسم! سیاہ تھا‘‘

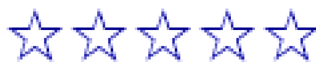
تھانیدار نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے کہا ’’کریم بخش! صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم اس سے ذاتی عداوت کا بدلہ لینا چاہتے ہو تم نے بہت زیادتی کی ہے میں سول سرجن کو فون کرتا ہوں۔‘‘

کریم بخش نے کہا ’’خان صاحب آدمی سے غلطی بھی ہو جاتی ہے۔‘‘

’’لیکن آئندہ میں ایسی غلطی برداشت نہیں کروں گا وہ کسی اچھے خاندان کا معلوم ہوتا ہے اب مجھے تمہاری طرف سے معافی مانگنی پڑے گی۔‘‘

گنڈا سنگھ نے کہا ’’جی یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی ہے حوالدار صاحب نے اس کی پیٹھ پر تیس بید مارے ہیں لیکن گالی دینا تو درکنار اس نے اف تک نہیں کی۔‘‘

تھانیدار نے کہا ’’میراں بخش اسے ویگن میں لٹا دو۔‘‘



رات کے دس بجے پولیس کی ویگن شہر کی ایک گلی میں آ کر رکی۔ سب انسپکٹر منصور علی نے نیچے اتر کر ٹارچ کی روشنی میں ایک مکان کا سائن بورڈ دیکھتے ہوئے کہا ”بھئی یہی مکان ہے۔“

پھر اس نے سلیم کو اپنے بازوؤں کا سہارا دے کر موٹر سے اتارا اور کہا ”چلو تمہیں پہنچا آؤں۔“

”نہیں آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں“

منصور علی نے انگریزی میں کہا ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے پرسوں اس تھانے کا چارج لیا ہے اگر تم یہاں ہوئے تو میں کل یا پرسوں کسی وقت تم سے ملوں گا۔“

جب سلیم اس کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا تو اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے، منصور نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا ”ہمت کرو غداروں کا اقتدار دم توڑ رہا ہے۔۔۔ اچھا خدا حافظ۔ ڈرائیور چلو۔“

موٹر چلی گئی اور سلیم تذبذب کی حالت میں تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد ڈگمگاتا ہوا مکان کے دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!! اس نے آوازیں دیں لیکن اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نحیف و لاغر آواز ڈیوڑھی اور صحن سے گزر کر سونے کے کمروں تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اچانک اسے خیال آیا کہ شاید گھر پر کوئی نہ ہو، شاید وہ گاؤں چلے گئے ہوں اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ وہ اپنے سر کو جو درد سے

پھٹ رہا تھا، دونوں ہاتھوں میں دبا کر دہلیز کی سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر ہاتھ سے دروازہ ٹٹولنے لگا۔ باہر کی کنڈی کھلی تھی اس نے ہمت کر کے دوبارہ دروازہ کھٹکھٹایا۔

گلی کی دوسری طرف سے کسی نے اپنے مکان کی کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے کہا ''کون ہے؟''

سلیم کو یہ آواز بے حد ناخوشگوار محسوس ہوئی اور اس نے بلانے والے کی مداخلت کو غیر ضروری سمجھتے ہوئے آواز دی ''ڈاکٹر صاحب!''

پڑوسی نے کہا ''ڈاکٹر صاحب گرفتار ہو گئے ہیں'' سلیم کا دل بیٹھ گیا۔ پڑوسی نے پھر کہا ''بھئی اگر گھر والوں سے کوئی کام ہے تو گھنٹی بجاؤ۔''

سلیم کو اب تک گھنٹی کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس نے تاریکی میں ہاتھ مارنے کے بعد گھنٹی کا بٹن دبایا اور دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر انتظار کرنے لگا۔ قریباً ایک منٹ کے بعد اسے مکان کے اندر چند مانوس آوازیں سنائی دینے لگیں اس نے دوبارہ گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کسی نے ڈیوڑھی میں بجلی کی بتی جلائی اور دروازے کی دراڑ اور روزن سے روشنی نمودار ہونے لگی۔

''کون ہے؟'' اندر سے آواز آئی

سلیم نے نحیف آواز میں کہا ''میں ہوں، سلیم!''

ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور راحت نے باہر جھانکتے ہوئے سوال کیا ''بھائی جان آپ؟ اس وقت؟''

سلیم جواب دیے بغیر لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ڈیوڑھی کے دوسرے سرے پر راحت کی ماں اور اس کے پیچھے عصمت کھڑی تھی اچانک راحت کو سلیم کے قمیض اور کوٹ پر خون کے دھبے اور چہرے پر ضربوں کے نشان دکھائی دیے۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کرتی ہوئی چلائی ''امی جان! یہ زخمی ہیں؟''

ماں نے آگے بڑھ کر سلیم کا بازو پکڑتے ہوئے کہا ''بیٹا! کیا ہوا تمہیں؟''

سلیم نے اپنی نیم وا آنکھیں اوپر اٹھائیں اور ڈوبتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''میں پولیس کے قابو آ گیا تھا۔''

ماں نے کہا ''چلو بیٹا اندر چلو!''

سلیم نے کہا ''چلئے میں ٹھیک ہوں یوں ہی چکر آ گیا تھا'' معاً سلیم نے اپنے دونوں ہاتھ پیشانی پر رکھ کر گردن جھکا لی۔۔۔ عصمت جو ابھی تک چند قدم دور بے حس و حرکت کھڑی تھی، اچانک آگے بڑھی۔ امی! یہ بیہوش ہو رہے ہیں! یہ کہتے ہوئے اس نے سلیم کا دوسرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور سلیم جیسے خواب کی حالت میں کہہ رہا تھا ''میں ٹھیک ہوں، آپ فکر نہ کریں یونہی چکر آ گیا تھا۔ اس نے میرے سر پر ٹھوکریں ماری ہیں۔''

عصمت اور اس کی ماں اسے سہارا دے کر کمرے میں لے گئیں اور وہ بدستور کہہ رہا تھا '' آپ چھوڑ دیں، آپ چھوڑ دیں آپ تکلیف نہ کریں، میں ٹھیک ہوں۔''

ماں نے کہا ''بیٹا! لیٹ جاؤ یہاں!''

اس نے گردن اٹھائی بستر کی طرف دیکھا اور بے اختیار منہ کے بل اس پر گر پڑا۔

عصمت نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے سلیم کے منہ پر دوائی لگاتے ہوئے کہا ''امی! یہ پولیس والے بالکل قصاب بن گئے ہیں دیکھیے! یہ بیدوں کے نشان ہیں۔راحت جلدی سے پانی گرم کرو۔سر کے زخم پر خون جم گیا ہے۔''

جب عصمت اس کے سر پر گرم پانی سے ٹکور کر رہی تھی، سلیم نے آنکھیں کھولیں عصمت کی ماں نے جھک کر پوچھا ''کیوں بیٹا اب طبیعت کیسی ہے؟''

''جی میں بالکل ٹھیک ہوں''

عصمت نے جھجکتے ہوئے کہا ''امی جان انہیں بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔''

ماں نے مسکرا کر کہا ''بہت اچھا ڈاکٹر صاحب!''

عصمت نے زخم پر پھاہا رکھ کر پٹی باندھی اور اس کے بعد میز سے گلاس اٹھا کر سلیم کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''یہ پی لیجئے!''

سلیم نے اٹھ کر گلاس پکڑ لیا اور متذبذب سا ہو کر عصمت کی طرف دیکھنے لگا اس کی ماں نے کہا ''پی لو بیٹا!''

''سارا؟'' اس نے پریشان ہو کر کہا

راحت بولی ''یہ دوا نہیں، پانی اور گلوکوز ہے۔''

میٹھے پانی کا گلاس پینے کے بعد سلیم نے دوبارہ تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا ''ڈاکٹر صاحب کب گرفتار ہوئے تھے؟''

عصمت کی ماں نے کہا پولیس انہیں کل شام پکڑ کر لے گئی۔ وہ مظاہرہ کرنے کے لیے باہر کے دیہات سے پانچ سو آدمیوں کا جلوس لے کر شہر میں داخل ہوئے تھے۔ ہمارا نوکر بھی ان کے ساتھ گرفتار ہو گیا ہے۔

''میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی اب آپ آرام کریں۔''

''بیٹا! خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے میں تم سے سب باتیں صبح پوچھوں گی۔۔۔اب تم آرام کرو ڈاکٹر صاحبہ مجھے گھور رہی ہیں۔''

ساتھ والے کمرے سے امجد آنکھیں ملتا ہوا آیا اور بستر پر سلیم اور اس کے گرد اپنی ماں اور بہنوں کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا ''بھائی جان کو کیا ہوا؟'' وہ بولا

''کچھ نہیں، چلو بیٹا سو جاؤ''

''نہیں امی جان! پہلے بتائیے نا بھائی جان کو کیا ہوا ہے؟''

''آؤ! بتاتی ہوں'' ماں اسے بازو سے پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔

راحت نے کہا ''بھائی جان! اب آپ کے سر میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟''

''نہیں، آپ آرام کریں''

عصمت نے راحت کو اشارے کے ساتھ کچھ سمجھایا اور اس نے کہا

''بھائی جان! اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو آپا جان کا خیال ہے کہ آپ کو ایک انجکشن دے دیا جائے۔''

ماں نے دوسرے کمرے سے کہا ''ہاں بیٹی! انجکشن ضرور دے دو۔''

سلیم نے کہا ''ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ

نہیں۔‘‘

عصمت نے اپنے باپ کے تھیلے سے انجکشن لگانے کا سامان نکالا۔ پانی ابال کا پچکاری کو صاف کیا۔ دوا بھری راحت، سلیم کی قمیص کی آستین اوپر چڑھا کر سپرٹ لگا رہی تھی کہ ماں نے آواز دی ’’بیٹی! ذرا احتیاط کرنا‘‘

عصمت ہچکچاتی ہوئی آگے بڑھی، سکول کے اس بچے کی طرح جو امتحان دینے کے لیے جا رہا ہو، اس کا دل دھڑک رہا تھا۔۔۔۔۔سلیم نے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ عصمت نے اپنے ہونٹ بھینچتے ہوئے اچانک سوئی بازو میں اتار دی اور راحت نے تھوڑی دیر کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ انجکشن لگانے کے بعد عصمت نے راحت کی طرف مڑ کر دیکھا، اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

ماں نے دروازے میں آ کر کہا ’’کیوں بیٹی لگا دیا انجکشن؟‘‘

اس کے منہ سے حیا میں ڈوبی ہوئی آواز نکلی ’’جی ہاں!‘‘

امجد اپنی چارپائی سے اٹھا اور نظر بچا کر دبے پاؤں چلتا ہوا راحت کے پاس آ پہنچا ’’آپا! ان کو کیا ہوا ہے؟‘‘

ماں نے کہا ’’دیکھو بے ایمان میں سمجھتی تھی یہ سو گیا ہے۔ چلو بیٹی جب تک تم یہاں ہو اسے نیند نہیں آئے گی۔‘‘

وہ دوسرے کمرے میں جا کر تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سو گئیں سلیم دیر تک جاگتا رہا۔ قدرت اسے اس کی توقع کے خلاف یہاں تک لے آئی تھی اب اسے

پولیس کے ڈنڈوں کا کوئی افسوس نہ تھا۔ عصمت نے اپنے مقدس ہاتھوں سے اس کے زخموں پر پھاہے رکھے تھے، اور اس کے نزدیک ان زخموں کی قیمت بہت بڑھ گئی تھی۔۔۔۔۔اس کے کانوں میں وہ میٹھی اور دلکش آواز گونج رہی تھی۔ وہ ان کانپتے ہوئے خوبصورت ہاتھوں کا تصور کر رہا تھا، وہ ان آنکھوں کا تصور کر رہا تھا جن میں محبت کے دریا موجزن تھے اس کی نگاہوں کے سامنے بار بار وہ حسین چہرہ آ رہا تھا جس میں دودھ شہد اور گلاب کے رنگوں کی آمیزش تھی۔

صبح کے وقت راحت نے سلیم کے بستر کے قریب تپائی پر چائے اور ناشتہ رکھتے ہوئے کہا ”بھائی جان! چائے پی لیجئے ابھی ڈاکٹر صاحبہ تشریف لانے والی ہیں۔“

سلیم نے پوچھا ”راحت تمہاری آپا ڈاکٹر کب سے بن گئیں؟“

راحت نے دروازے سے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی سلیم کی طرف متوجہ ہوئی ”بھائی جان! آپ کو معلوم نہیں؟ آپا جان تو اس شہر کی بہت مشہور ڈاکٹر ہیں انہیں نزلے اور زکام کا علاج آتا ہے کھانسی کی گولیاں مفت تقسیم کرتی ہیں گلی کے بچوں کی آنکھوں میں دوائی بھی ڈال دیتی ہیں۔“

امجد نے اندر داخل ہو کر کہا ”بھائی جان! آپا جان سے آنکھوں میں دوائی نہ ڈلوانا بہت لگتی ہے کان کے درد کو بھی ان کی دوائی سے کوئی آرام نہیں آتا۔“

عصمت شرماتی اور جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، امجد اس کے تیور دیکھ کر دوسرے دروازے سے صحن کی طرف نکل گیا۔ راحت نے اپنے ہونٹوں پر شرارت آمیز تبسم لاتے ہوئے کہا ”ڈاکٹر صاحب مبارک ہو! آپ کا علاج کامیاب ہے۔“

عصمت کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی اور وہ ایک نظر سلیم کی طرف دیکھنے کے بعد بولی ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں'' سلیم نے جواب دیا

راحت بولی ''اجی اتنے مشہور ڈاکٹر کا علاج ہوا اور آپ ٹھیک نہ ہوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

عصمت نے گھور کر راحت کی طرف دیکھا ''بڑی چڑیل ہو تم؟''

''ڈاکٹر بننا بری بات تو نہیں'' سلیم نے کہا

عصمت نے کہا ''جی یہ مذاق کرتی ہے میں نے میٹرک کے بعد فسٹ ایڈ سیکھی تھی اور انہوں نے مجھے ڈاکٹر کہنا شروع کر دیا۔''

سلیم نے کہا ''بہر حال مجھے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ایک اچھے ڈاکٹر سے مجھے اس سے بہتر علاج کی توقع نہ تھی۔''

''جی مجھے ابا جان نے چند دوائیاں بتا دی ہیں''

عصمت کی ماں کمرے میں داخل ہوئی اور اسنے سلیم کے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا ''بیٹا! میں پچھلے پہر تمہیں دیکھنے کیلئے آئی تھی، تم سو رہے تھے۔ اب طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''جی ہاں! اب میں بالکل ٹھیک ہوں''

''تم یہاں پولیس کے ہاتھ کیسے آ گئے بیٹا؟''

عصمت اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی تھی لیکن ماں کا یہ سوال سن کر وہ